



# انیسویں

— مزاحیہ مضامین —

ڈاکٹر حبیب ضیاء



## سلسلہ مطبوعات زندہ دلان حیدرآباد

سال اشاعت :	جنوری ۱۹۸۸ء
کتابت و سرورق :	محمد غوث الدین
تعداد :	ایک ہزار
طباعت :	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس - حیدرآباد
قیمت :	۱۴ روپے

## — ملنے کے کدے —

دفتر شگوفہ، بچپرس کواٹریس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد  
 بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، اردو ماں، حمایت نگر، حیدرآباد  
 الیاس ٹریڈرس - شاہ علی بندہ، حیدرآباد  
 حسامی بک ڈپو، چارکسان، حیدرآباد  
 سیل کاونٹر، روزنامہ سیاست، حیدرآباد  
 ایوان اردو، ناظم آباد، کراچی، پاکستان



# ڈیڑھ سالہ نواسی سارہ

کے  
نام

خدا اسکی عمر دراز کرے، دین و دنیا کی نعمتیں عطا فرمائے، ماں باپ  
اور سب رشتہ داروں کے علاوہ اس کے دل میں اردو کی بھی  
محبت جاگے، بڑی ہو کر وہ یہ کتاب پڑھے اور اپنی سہلیوں  
سے فخر یہ کہے "یہ کتاب میری مرحوم نانی نے لکھی تھی"۔



# حصہ ص ۱

یکم نومبر ۱۹۳۵ء

۱۹۵۹ء

مطبوعہ ۱۹۴۳ء

۱۹۴۴ء

مطبوعہ ۱۹۷۸ء

مطبوعہ ۱۹۸۱ء

۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۴ء

ایڈیٹرز اردو کالج، اردو ہال، حمایت نگر

۱۹۸۴ء تا حال

یونیورسٹی کالج فار ویمن (جامعہ عثمانیہ)

پانچ پیدائش

ایم۔ اے

”دکنی زبان کی قواعد“

پی ایچ ڈی

”مہاراجہ کشن پرشاد شاد“

”گوتم مشکل“

ملازمت





# مصنف کی دوسری کتابیں

گویم مشکل ..... طنزیہ و مزاحیہ مضامین

ہمارے سرکش پرشاد شاد حیات اور ادبی خدمات

دکنی زبان کی قواعد

زیر طبع

دکنی زبان کی قواعد (دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

شاد و نیاز (نیاز فتح پوری اور ہمارے سرکش پرشاد کی خط و کتابت)



# ترتیب

۱. پیش لفظ ۱۳
۲. عید ۱۵
۳. ٹیٹ ۲۰
۴. اچھے پڑوسی ۲۴
۵. سولہ برس کا سن ۳۱
۶. باہر کا دولہا ۳۵
۷. ہزاروں خواہشیں ایسی ۴۰
۸. خوش رہنا بھی ایک فن ہے ۴۲
۹. ہم پشماں نہ ہوئے ..... ۴۹
۱۰. حیدرآباد کی شادیاں ۵۴
۱۱. ریل ریلوے اسٹیشن ۵۹
۱۲. میرا پہلا مزاجیہ مضمون پڑھنا ۶۴
۱۳. حیدرآباد کی سڑکیں ۶۸
۱۴. تم آٹو واسے ۷۱
۱۵. چکر ۷۷
۱۶. جہیز کی لعنت اور سلج ۸۲
۱۷. تبصرے ۸۴



# پیش لفظ

”گویم مشکل“ کے بعد طنزیہ مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ”آئیں میں“ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ ہلک کا لاکھ احسان ہے کہ میری تینوں کتابیں، دکنی زبان کا توالد، ہمارا جہ کش پرشاد حیات اور کارنامے، اور گویم مشکل ادبی حلقوں میں سراہی گئیں۔ آئندہ اپریش اردو اکیڈمی اور اتر پردیش ادو اکیڈمی نے اپنے گراں قدر ایوارڈز اور توصیف ناموں سے نوازا۔ ایچ اے ایچ دسی نظامس ادبی ٹرسٹ اور آئندہ اپریش اردو اکیڈمی کا مالی تعاون بھی حاصل رہا۔

گذشتہ سال میری والدہ محترمہ فخرانسا بیگم صاحبہ پاکستان سے حیدرآباد تشریف لائیں۔ وہ بڑی خداترس اور دیبا دل خاتون ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ چند دن قبل انہیں افامی بانڈ میں دس ہزار روپے ملے، انہوں نے اللہ میاں سے وعدہ کیا تھا کہ انعام کی رقم خود خرچ نہیں کریں گی بلکہ کسی ضرورت منکودیں گی۔ میں نے اپنے مضامین کے بکھرے کاغذان کے آگے ہسار کر کہا ”اس وقت تو سب سے بڑی ضرورت منڈ میں ہی نظر آ رہی ہیں اس طرح ہسی ہسی میں کتاب کے چھپنے کا سامان ہو گیا۔“

اس مجموعے کے کئی مضامین آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں ”عید روزنامہ حبیبیہ میں حیدرآباد کی شادیوں، روزنامہ رہنمائے دکن میں ادب پر مشتمل روزنامہ منصہف شگوفہ سب رس (پاکستان) اور دوسرے ادبی رسائل میں

شائع ہو چکے ہیں۔ صحافت، آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور زندہ دلائل حیدرآباد کا شکریہ ادا کرنا میرا اولین فریضہ ہے۔ محمد غوث الدین نے اس کتاب کی کتابت اور سرورق بنانے کا کام نہایت محنت دلچسپی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ میری نیک تمنائیں ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں۔ کتاب کے لئے کوئی موزوں نام میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ غوث نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ "آئیس بیس" انہیں کا تجویز کردہ نام ہے۔

ادبی مشغلوں کو جاری رکھنے کے لئے پرسکون ماحول کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں گھر کے افراد کے علاوہ کالج کے پرنسپل صاحبین کا خصوصیت سے ذکر کروں گی۔ انہوں نے نہ صرف میرے مضامین پڑھے بلکہ وقتاً فوقتاً دار بھی دی۔ پروفیسر حسنی شاہد صاحب پرنسپل اردو اور انٹرنیشنل کالج پروفیسر قادری بیگم صاحبہ سابق پرنسپل ویمنس کالج اور پروفیسر بدرتقی خان صاحبہ کے خلوص اور شفقت کو میں کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ اکمال صاحب مدیر ماہنامہ شگوفہ کا شکریہ ادا کرنا میرا اہم اور آخری فریض ہے جنہوں نے درخواست پر اس کتاب کی طباعت اور اس کے بعد کے سارے مراحل اور ذمہ داریوں کو سرے کر اپنی مصروفیات میں دو گنا بلکہ چار گنا اضافہ کر لیا۔

**حبیب ضیاء**

NB-13,

IDPL COLONY,

BALANAGAR,

HYDERABAD, 37, A.P.

# عید

عید کے معنی خوشی کے ہیں۔ عید اپنے وقت پر آتی ہے۔ کسی کو اچانک بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے بے وقت کی عید منائی۔ بہت دنوں تک غائب رہنے کے بعد کوئی آتا ہے تو اسے کہتے ہیں "تم تو عید کا چاند ہو گئے۔" وقت گزر جانے کے بعد بے موقع کام کریں تو اس کے لیے "عید کے چھپے ٹر" والی کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔

ماہ رمضان کا چاند دیکھتے ہی لوگ عید کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ عید کے لیے خریدی جانے والی چیزوں میں سب سے پہلا نمبر کپڑوں کا آتا ہے۔ بعض لوگ سہولت کی خاطر علی الحساب بیس بیس میٹر کپڑا ایک ہی پرنٹ کا خرید لیتے ہیں۔ صدر خاندان کا مندرجہ بنانے کے بعد جو کپڑا بچتا ہے اس میں سلسلہ والے بچوں کی عمر اور قد کے لحاظ سے درزی کو ناپ دے کر چار پانچ جتنے بھی مندرجہ درکار ہوں، سلوا لیتے ہیں۔ یہی فارمولا لڑکیوں کے کپڑوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کر مختلف گھر والے میز پر کھڑے کھانے کے لیے جب یہ یونیفارم دالی ٹیم باہر ملتی ہے تو ہر کسی کی نظریں اس پر جم جاتی ہیں۔ کثیر الحال دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے "ماشاء اللہ کل جاتا ہے۔ ہم دہلا رہے دو" والا دیکھتا ہے تو زبان کو گام دے



بغیر چھتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ جاتے گھر میں اور کہتے ہیں ؟

عید کی آمد سے قبل زکوٰۃ دینے کے فرض سے بھی سبکدشی ضروری ہے۔ اگر لوگ زکوٰۃ کے کپڑے خریدنے کے لیے ایسی دکان تلاش کرتے ہیں جہاں کم سے کم ردیوں میں زیادہ سے زیادہ زکوٰۃ کا ثواب مل جائے " ایک ساڑی کی قیمت میں تین ساڑیاں ایسے ہی ثواب کمانے والوں کے لیے فروخت ہوتی ہیں۔

عید اور شیر خرما لازم و ملزوم ہیں۔ شیر خرا پیسے کی چیز ہے لیکن بعض باہر کو ان خواتین اس میں سیویوں کے علاوہ گھی، بادام، چروخی، زعفران اور کھجور کی مقدار میں ملاتی ہیں کہ وہ گاڑھا ہو کر "شیر قورمہ" بن جاتا ہے۔ ہر دفعہ ایک نئی چیز میں آتی ہے۔ کبھی پنڈ کھجور کا بڑا ٹکڑا تو کبھی کشمش اور کبھی غلطی سے رہ جلنے والا ثابت بادام۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسا عسوس ہوتا ہے کہ شیر خرما نہیں بلکہ کوئی معجون ہے۔

عید کے دن ہر گھر میں سیویاں ابالی جاتی ہیں۔ سیویں کا میٹھا بنتا ہے اور سیویں کا شیر خرا بنتا ہے۔ شیر خرا صرف گھر پر ہی نہیں پلایا جاتا بلکہ اڈوں پر ڈوس دوست احباب اور رشتہ داروں کے پاس خاص اہتمام سے بھیجا بھی جاتا ہے مختلف گھروں سے شیر خرے کے جو حصے آتے ہیں انہیں خالی کرنا اور رکھنا بڑے مہر کے کام ہے۔ ایک گھر سے آئے ہوئے شیر خرے میں بائیک سیویاں ہوتی ہیں تو ایک میں ٹوٹی۔ ایک میں بیمار چروخی کی کثرت۔ ہوتی ہے تو ایک میں صحت مند بادام۔ ایک ٹکڑے میں چھپے کو غوطا دیں تو اس کی تہہ سے دودھ پیسے ہوئے مست کھجور برآمد ہوتے ہیں تو ایک میں کھوپڑا تیرنے کے موڈ میں رہتا ہے سیویوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ ابلی ہوئی بہت ابلی ہوئی بہت زیادہ ابلی ہوئی اور حلونا جیسی لچھی بون، کھوپڑا اپنی رنگینوں سمیت ضرور موجود رہتا ہے۔ عید کے دن ہوشیار خواتین بالخصوص غانے میں دو خالی گونے رکھتی ہیں۔ مختلف جگہوں سے آنے والے گٹھروں کو ایک

بلوئے میں اور طشتریوں کو دوسرے بلوئے میں انڈیل کر حصہ بیچنے والے کو شکر یہ سلام اور عید مبارک کہلوا بھیجتی ہیں۔ جب انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب کہیں سے حصہ نہیں آنے کا وہ چستی کے ساتھ اس نورنگ بشیر خرے اور ملی گھر سیولوں کے حصے کا ناشروع گم دیتی ہیں۔ اوپر سے اپنے ہاتھ کے تلے ہوئے کاجو اور اپنے ہی ہاتھوں سے رنگا ہوا گھوپیرا بکھیر دیتی ہیں۔ ان کی آن میں سارے لوگوں سے نبٹ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہیں۔

نور جتنا پرانا ہوتا ہے مالک کے لیے اتنا ہی عذاب جان بنتا ہے۔ ایک گھر میں ماما برسوں سے کام کرتی چلی آ رہی تھی۔ پکان گھر کی صفائی کے ساتھ ہاتھ کی صفائی میں بھی اسے کامل جہارت تھی۔ مگر اسے نکال باہر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن جب بھی کوئی چیز چوری جاتی وہ اسے یوں کوستیں

”خدا کرے تیرے دیدے گھٹنے بھوٹ جائیں۔“

ماما کو یہ کوسا یقیناً برا لگتا تھا لیکن چونکہ اس کے سارے طاقتور تھے اسی لیے اسے کوسا لگتا نہیں تھا۔ ایک عید کے موقع پر اس نے فرانس کی گے ایسے باکھل دیسی ہی ساڑی چاکا جیسی مالکن پہننے لگی۔ مالک تو تیار ہو گئے لیکن مالکن کے دھار کا مسئلہ تھا۔ اس کی فرانس کو انہوں نے ایک ہی لات میں ٹھکرا دیا۔ اس دل چلی نے مالکن کو یوں کوسا دیا۔

”خدا کرے اس گھر کا شیر خرا پھٹ جائے۔“

مالک کے دل سے نکلی ہوئی بددعا یہی شیر خرا کو جا لگی۔ لہذا کاسا شیر خرا پھٹ کر ”شیر خرا بن گیا۔“ کسی گھر میں جب شیر خرا پھٹ کر خواب ہو جاتا ہے تو یہ خبر یاں پڑوس کے گھر والوں کے علاوہ رشتہ داروں میں الگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ دودھ بھی خواب ہو تو شیر خرا ختم ہونے کے بعد دیر سے آنے والے دوست احباب اور رشتہ داروں کو یہ کہہ کر بے آسانی پیدا جاسکتا ہے کہ ہم نے دس لیٹر دودھ کا شیر خرا بنایا تھا۔ مگر سارا پھٹ گیا۔ کبھی ایسا بھی

ہوتا ہے یہ شیر خرا اچھا تو بنتا لیکن ناساز گاہ حالات میں مدین خراب ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ ایسا  
 ہی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ایک بڑے افسر کی زیر نگرانی ایک ہی احاطے میں دو مختلف  
 ادارے تھے۔ دونوں ادارے والوں نے شاندار عید منانے کے لیے شیر خرمانے کا بطور  
 خاص اہتمام کیا۔ ایک ادارے والے خوش خوشی اپنے افسر کو مدعو کرنے پہنچے۔ پتہ نہیں  
 افسر کا موڈ خراب تھا یا کیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے ناخوش کو بھی طرح ڈالٹ  
 دیا کہ میری اجازت کے بغیر تم لوگوں کو ادارے کے احاطے میں شیر خرمانے کی ہمت  
 کیسے ہوئی۔ اطاعت گزار ناخین انتہائی دل شکن ہو کر لوٹ گئے۔ کسی نے بات کایوں  
 بنکر بنا یا کہ افسر کی اجازت کے بغیر دوسرے بھی شیر خرما نہیں بی سکتے۔ شیر خرما کسی نے  
 نہیں بیا۔ افسر صاحب ادھر ڈانٹ بلا کر ادھر شیر خرما پیتے چلے گئے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا  
 ہر کدہ والی سارا شیر خرما پھٹ چکا تھا۔  
 نتیجہ کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔

عید کے دن شیر خرے کے علاوہ عیدی کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عیدی دینے والے  
 اپنی استطاعت اور لینے والے کی حیثیت دیکھ کر عیدی دیتے ہیں اکثر والدین عید کی آمد  
 سے ایک ماہ قبل اپنے بچوں کو باقاعدہ تربیت دیتے ہیں کہ جو بھی ملے گئے خواہ وہ دور کا  
 رشتہ دار ہو یا قریبی دوست اقد کر کے زبردستی عیدی وصول کریں۔ اور جب تک اس کا  
 ہاتھ جیب کا رخ نہ کرے اس کا شیر خرما حرام کر دیں۔ اس جملے سے بڑے بڑے لوگ  
 آنے والی عید کے لیے ان گھروں پر سرخ خطرے کا نشان لگا دیتے ہیں۔  
 ایک نے پیش امام کو عید کی نماز سے قبل ایک بڑا مجمع ہاتھ کیا۔ انہوں نے موقع کو  
 غنیمت جان کر کہنا شروع کیا۔  
 ”آج آپ نماز پڑھنے آئے ہیں مگر آپ کا دل کہیں ادھر ہے۔ آپ یہ سوچ رہے

میں گے کہ جلدی سے سجدے ملاؤ کسی سنیابال کا رخ کریں گے۔ میں ایسا نہیں ہونے  
 دوں گا۔ مجھے اتنا بڑا مجمع بھر کبھی نہیں ملے گا۔“

انہوں نے بہت ہی موثر انداز میں حاضرین کے حال پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے آنے والے  
 کل سے ہوشیار کیا۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”آج آپ نہا کو نئے کپڑے پہن کر خود سے چل کر یہاں آئیں۔ کل آپ کو  
 پہلا کو کفن پہنا کر چار آدمیوں کے کندھوں پر لایا جائے گا۔ آج آپ یہاں سے  
 خوشی خوشی گھر واپس جائیں گے۔ کل آپ کو یہاں سے شہر خمرشاں لے جایا جائے گا۔  
 آج آپ نے اپنے جوتوں کی ڈودیاں اپنے ہاتھوں سے بانڈھی ہیں۔ کل دوسرے  
 لوگ آپ کے انگوٹھے بانڈھیں گے۔“

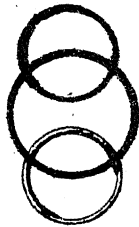
اس کے بعد وہ ان نوجوانوں سے مخاطب ہوئے جو حست لباس پہن کر آئے تھے۔ ان کی عیب  
 کی خوشیاں پیش نام صاحب نے اس طرح ملایا میٹ گئیں۔

آج کے نوجوان فیشن پرستی میں مگن ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج آپ اپنے والدین کے منع  
 کرنے پر بھی ایسا لباس پہن کر یہاں آئے ہیں لیکن یاد رکھئے کہ کل آپ کو سفید ڈھیلا  
 ڈھلا لباس پہنا کر یہاں لایا جائے گا۔

بہر حال اس وعظ کو سننے کے بعد لوگوں کا موڈ ٹپ گیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا کہ اس سال  
 تو یہاں سے نکل کر دوست احباب کے پاس جائیں گے۔ کینڈہ سال ہو سکتا ہے دوست احباب  
 پھل تجماد کرنے آئیں گے۔

وعظ ختم ہوتا ہے لوگوں کی پریشانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی دوران کسی کی حسیب  
 خالی ہوئی تو کسی کا جوتا غائب ہوا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے چلتا رہے گا۔ سب خوش خوش اپنے  
 گودوں کو لٹٹے ہیں۔ عورتیں بچہ بچہ تیار رہتی ہیں۔ انعام کئے لئے آنے والوں کا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے۔ رنگ برنگی کھشتی پوش پڑی ہوئی کشتیاں ایک گھر سے دوسرے گھر لیجاتی جاتی ہیں۔ سڑکوں پر گلی کے نکڑوں پر لوگ انتہائی گرم جوشی سے گلے ملتے ہیں اور عید کی مبارکباد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہر حال عید کے دن کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ خدا کو سے یوں ہی عید ہر گھر آئے اور ہر سال اپنی بہادریں لٹاتی رہے۔



# ہلمٹ

ہلمٹ کب کیوں اور کس نے بنائی یہ تحقیق طلب موضوع ہے۔ کوئی نے ہمالیہ میں لازمی ہے اور کوئی نے ہمالیہ میں اختیار ہی اس بات کا سروے کوئی ریپرچ اسکاڑھیک ڈھنگ سے کر رہا ہے۔ بہت دنوں کی خاموشی کے بعد ہلمٹ نے پھر دھوم مچائی۔ جن لوگوں کے پاس پرانی نہیں تھیں ان میں سے چند نے خرید لی اور چند لوگوں نے پہلی تاریخ کے آنے تک مختلف طریقوں سے پولیس والوں کو مہر و فہر ریکھا۔ پھر سروں کے مقابلے میں ٹینس کا تناسب بڑھ گیا۔ ذات پات مذہب فرقہ جھوٹے بڑے غرض کہ میں دو کا فرق مٹ گیا۔ لوگ بے اختیار کہہ اٹھے۔

ہندو مسلم اور عیسائی - لگتے ہیں سب بھائی بھائی

کبھی ایسا ہوا کہ ہلمٹ کی آڑ میں ایک شخص نے دن بھارے کسی سے ہزاروں کی رقم چھین لی اور فرار ہو گیا۔ خبر چھپ گئی کہ پولیس کو اس ہلمٹ والے اسکوٹر سوار کی تلاش ہے۔ ہلمٹ امار چھیننے کے بعد بھلا وہ کیسے ہاتھ ملک سکتا ہے۔

ہلمٹ کے لزوم سے پہلے تو غیبی ہم کا زور و شولہ سے چڑھا تھا۔ مختلف سروں پر مختلف طریقوں سے ہلمٹ چڑھائی جا رہی تھی۔ کھلے سروں کو رنگ کر ایک دہ دار شخص کہہ رہا تھا۔ ”ہم لو میرے بھیا ہلمٹ! یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ سودے سلف کے کام آتی ہے۔ پیچھے بٹھی ہوئی بیوی کی ایک ایک اور اس کی فرمائشوں سے بچاتی ہے۔ راستے میں موقع بڑے تو بچوں

گو بھی فراغت دلاتی ہے اور دعوتوں میں تو اس کا باطل صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بلٹ کا سب سے بڑا خاتمہ یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا خواستہ کوئی حادثہ ہو جائے تو سرے ٹل جاتا ہے۔ اسکوٹر لٹل لاکھ احتیاط سے چلائے پیچھے سے ٹکر مارنے والے بس یا لاری ڈرائیور کو کون روک سکتا ہے جو یہ ہوتا ہے کہ لاری موٹر کو مانتی ہے، موٹر آؤ کو اور آؤ اسکوٹر کو۔ پسیل چلنے والوں کے لئے کسی کا اجارہ نہیں، انہیں کوئی بھی مار سکتا ہے۔ دسلے بلٹ کا لزوم تو سب سے پہلے پسیل چلنے والوں کے لئے ہونا چاہیے۔

کچھ دن ایسے بھی گزرے کہ بلٹ موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ لازمی نہیں کی گئی تھی مختلف گوشوں سے اس کی مخالفت کی جا رہی تھی۔ نئے نئے انداز سے احتجاج کیا جا رہا تھا۔ ایک دن اخبار میں لکھا دیکھا کہ اسکوٹوراں ۳۰ ستمبر ۸۶ء کو پگڑیاں باندھ کر "بھیرٹ کا فقدان کا دن" منانے والے ہیں۔ ہم خوش ہو گئے کہ رنگ ریزوں کا بھلا ہو گا۔ رنگ یرنگی پگڑیاں سڑکوں پر اچھلتی نظر آئی گی۔ ۳۰ ستمبر گزر گیا، بڑی مایوسی ہوئی۔ اسلئے کہ اس دن صرف نو ہی افراد گرفتار کئے گئے۔ ویسے ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ لوگ پگڑیوں میں یو بھلا دیں اور اسی قسم کی کچھ چیزیں دیکھ لیتے تو گرفتاری کی آفت سے بچ جاتے۔

بلٹ لازم ہوئی تو کچھ دن شور مچا کہ آئی ایس آئی [ISI] نشان والی بلٹ ہی بہنسنی چاہیے دوسری بلٹس کو شمار نہیں کیا جا رہا تھا۔ لوگوں نے حسب دستور احتجاج کیا کہ مخصوص نشان والی بلٹ کا لزوم کیوں تو پتہ چلا کہ کسی اثر والے مندر نے اپنے سالے کے بیرون گار مینوئی کو لوٹ گار سے لگایا تھا۔ چند برسوں سے بلٹ کو کتابھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ یکایک زمانے نے پٹا کھینچا۔ پولیس حرکت میں آئی گئی جڑ ملنے کا خیال آیا تو ایک صاحب نے صبح آفس جانے سے پہلے بیوی کو آواز دی۔ "سنو! جلدی سے میری بلٹ کو دینا۔ بیوی نے کہا: "آپ بڑے بے رحم ہیں" ترس کھائے ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر۔ شوہر سٹپٹا گئے، بولے "میں نہ صرف بچوں پر رحم

پس اگر ان لوگوں کو بلا تھیں جس دل و جان سے چاہتا ہوں اسی لئے تو ہلٹ چکے ہیں۔" بیوی نے وضاحت کی "آپ کی عقل ماری گئی ہے" میں ان پر ہنسے گئے عجیب کی بات کر رہی ہوں جو آپ کی ہلٹ میں پروان چڑھ رہے ہیں، بڑے پیارے بچے ہیں، چلنے سے ہی کم از کم چھٹی تو ہو جائے دیجیے۔"

مختلف چیزیں ملنے کے بلنے کے مخصوص مقام ہوتے ہیں: مخصوص دکانیں بوقت ہیں جسے ہنڈ گھروں کے لوگ دولت مند گھرانوں میں بیٹھتے ہیں، غریب اور مجبور لوگ یاں سعودی عرب میں بکتی ہیں لیکن ہلٹ کے بکنے کی کوئی مخصوص دکان نہیں۔ اسپورٹس کی دکان، پرس اور سوٹ کیس کی دکان، کھلونے کی دکان، کرانہ کی دکان، یہاں تک کہ ہلٹ کی دکان پر بھی ہلٹ فروخت ہو رہی ہے۔ ایک کرانہ کی دکان پر پلاسٹک کے بیگٹوں میں کچھ چیزیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ایک بچہ دکان پر یا ایک پاکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "۲۵ پیسے کے تل کے لڈو دو"۔ دکان والے نے اپنی ہانک محسوس کی۔ غصے سے کہنے لگا "یہ کھوکھلا لڈو تمہارے کھانے کے لئے نہیں تمہارے باپ کے سر کو بچانے کے لئے ہے۔"

جس طرح آٹو سیکل کشا اور لاریوں کے پیچھے مختلف قسم کے معنی خیز لکھ دو معنی اشعار لکھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آج کل ہلٹ بنانے اور بیچنے والی مختلف کمپنیوں اور ایجنسیوں نے دکانوں پر مختلف اشعار لکھوا رکھے ہیں۔ ایک صاحب دو تین مرتبہ پولیس والوں سے لپٹ کر بولی کرنے اور چالان دینے کے بعد ہار مان کر ہلٹ کی دکان پہنچے۔ ہلٹس کے سامنے اٹاکی بے شمار غلطیوں میں ڈوبا ہوا یہ شعر لکھا تھا۔

میرا وقت مقرر ہے وقت پہ اپنے آؤں گی • ہلٹ پہنویا یہ پنہوسا تھ تمہیں بے جاؤں گی  
اس شعر سے وہ بے حد متاثر ہوئے جھٹ سے ایک سرخ رنگ کی ہلٹ خرید کر اپنی لی۔ آٹھ  
میں اپنے چہرے کو بڑھا۔ جلی حرفوں میں لکھا تھا "بڑھا بندہ" اس بات کی انہوں نے مطلق پروا



نہی۔ ان کی ساری توجہ دل کو چھو لینے والے اس شعر پر تھی۔ ایسٹرن میں کسی غیر خاتون کی طرف سے یہ پہلا بلاؤ تھا۔ واہ واہ کہتے ہوئے دکاندار سے پوچھا بڑی اچھی شاعر ہیں، کیا تخلص کرتی ہیں؟ جواب ملا "موت"۔

ایک ملازم سرکار اپنے تین بچوں اور بڑی بیوی کو روزانہ اسکول پر بٹھا کر اسکول اور آفس کو چھوڑتے ہیں۔ چھوٹی ٹان میٹرک بیوی امور خانہ داری انجام دیتی ہیں۔ اچھے خاصے سر پر ہو ہے کاشیڈ دیکھ کر بچے نے سوال کیا۔ "ڈیڈی! آپ یہ کان ٹوپ کیوں پہننے لگے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "پولیس والوں کا کہنا ہے کہ اسکول سے گزرنے والے سر محفوظ رہے گا" بچے کا سوال تھا "ہمارے سرول کا کیا ہوگا ڈیڈی؟"

ویسے ہلٹ ہے بڑے کام کی چیز۔ ہمارا شعور ذرا سا بھی بیدار ہو جائے تو اس سے بہت سے بامقصد کام لیے جاسکتے ہیں۔ سر پر ہو تو اوندھی، قانوکریٹا دیں تو کاسہ بن جاتی ہے۔ اردو کے جلسوں میں اس کا سے کا صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایسے معزز حضرات جو بڑے فخر سے اردو کو مادری زبان کہتے ہیں، بڑے بڑے جلسے منعقد کر کے حکومت سے اسکی نالافتائی کا دکھڑا روتے ہیں، اس زبان کے ختم ہو جانے کا مصنوعی اہل پیشگی غم کرتے ہیں، ان کے سامنے یہ کاسہ بھلا کر کہتی ہوں کہ وہ خدا کے لیے یہ بات کبھی زبان پر نہ لائیں کہ اردو ختم ہو رہی ہے اس کے بجائے وہ اپنے گریبان کی طرف نظر کریں۔ ان کا بچہ اگر فغنی ٹو کا ترجمہ "بادن" کر سکتا ہے تو میں یقین دلاتی ہوں کہ اردو زبان ابھی ختم نہ ہوگی۔

ہلٹ کے بارے میں یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہلٹ متعلقہ عہدیداروں کی فرض شناسی کی ایک علامت ہے۔ اس کے لزوم میں کتنی صداقت کتنی سنجیدگی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب موڈ آیا چالان کیا اور جب جی چاہا انجان ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ چالان کنانی ٹہرا تو ان لالوں کو کریں جو رات دن سڑکوں پر دھویں کے بادل بکھیر کر

دندان قاپٹتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ لوہے کی خطرناک سلاخوں سے بھری ان کارڈوں کو ٹکیں جو کسی بھی لوہے کی رولہ کی زندگی کو موت سے بدل دیتی ہیں۔

ہلمٹ جی کا جنجال ہے۔ اکثر لوگ پہننے کے بجائے اسکوٹریٹ مانگ رہے ہیں یا میوی کے ہاتھ میں تھما رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے استعمال میں سلامتی کا تصور کم دور جمانے کا خوف زیادہ ہے۔ ہلمٹ نہ پہننے والوں کے لیے چالان کیا جا رہا ہے۔ چند مخصوص مقامات پر مخصوص وقتوں میں اسکوٹریٹس کو روکا جا رہا ہے۔ بعض صاحبین سفید پوشاگ اور سفید ہلمٹ دیکھتے ہی اپنے چکھتے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہیں اور ادلوں کے خیال سے اسکوٹریٹ کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ وقتی طور پر اپنے آپ کو پاؤں خوش ہوتے ہیں لیکن یہ بھل جاتے ہیں کہ سڑک کے کھڈے انھیں صحیح سلامت نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر ایماندار جدید ادول کی نگرانی میں سڑکیں بن جائیں، عوام سڑک کا صحیح استعمال کرنے لگیں تو پھر انشا اللہ نہ تبدیل چلتے والوں کو ہلمٹ کی ضرورت ہوگی نہ اسکوٹریٹس کو۔ اب رہا ہلمٹ بنانے والوں کے رہنما کار کا مسئلہ تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ خدا و راق ہے اس کی طرف سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔



# اپنے پڑوسی

ہر مذہب نے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا سکھایا ہے۔ چھ پڑوسیوں میں  
 خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ وہ لوگ انتہائی خوش نصیب ہیں جن کے پڑوسی  
 شریف ہوتے ہیں۔ ورنہ پاس پڑوس کے چار پیانچ گھروں میں سے ایک بھی کم ظرف  
 ہو تو سارے لوگوں کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جان بوجھ  
 کر شرابی نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کی فطرت انہیں مجبور کرتی ہے کہ اپنے پڑوسی کو کسی نہ کسی  
 طرح تنگ کریں۔ کالونیوں میں اس قسم کے پڑوسیوں کے بہت سے واقعات دیکھنے اور  
 سننے کو ملتے ہیں۔ ایک دفعہ جبکہ ہم نے گھر تبدیل کیا تھا، گنگوں کی حفاظت کی خاطر ان کے  
 اطراف کٹی ہوئی خاردار جھاڑیاں لگا دیں اور پڑوسیوں پر واضح کر دیا کہ یہ بالکل عارضی  
 انتظام ہے۔ لیکن دوسرے دن دس بارہ لوگوں کی دستخط کے ساتھ ایک شکایت آفس  
 پہنچ گئی کہ پڑوسی کے بچے کے پاؤں میں کانٹے چبھ سکتے ہیں۔ اس لئے فوراً نکال دے  
 جائیں۔ ہم نے پڑوسی سے پوچھا "آپ کا بچہ کہاں ہیں؟" اس نے جواب دیا۔  
 "ناں کے پیٹ میں۔" ہم نے پھر پوچھا "ناں کہاں ہے؟" اس نے اطمینان سے  
 جواب دیا۔ "وہ گاؤں میں ہے" ابھی آنے والی ہے، چار پیانچ ماہ بعد..... بچے  
 کو جہنم دے دیے گئے!

بعض لوگوں میں تو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ بتا ہا بتا کر ٹھٹھا اور دونوں کو رٹ تک جا کر ہی چین کی بانسری بجاتے ہیں۔ کسی گھر میں پڑوس کی نوکرانی سے جھگڑا شروع ہوتا ہے تو کسی کے پاس بچوں کی آپس کی لڑائی، بڑا دل تنک پہنچ جاتی ہے۔ بات کچھ نہیں ہوتی۔ فریقین میں سے ایک بھی اگر سوچو بوجھ سے کاہلے تو قصہ وہیں رفع دفع ہو جاتا ہے لیکن لوگ اس کو وقار کا مسئلہ بنا کر آگے بڑھتے ہی جلتے ہیں۔ سنا کہ ایک گھر میں رہنے والی خاتون ادپری منزل سے نیچے کچر پھینکا کرتی تھی۔ پڑوس نے ہر طریقے سے اسے اس فعل سے باز آنے کے لئے کہا لیکن وہ کسی طرح مانتی نہ تھی۔ تنگ آکر اس نے اسکا پھینکا ہوا کچرا جمع کرنا شروع کیا۔ پھر ایک پیکٹ میں ڈال کر پڑوس کی بجی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ کچرا پھینکا تو سینہ کر دیا لیکن دل میں دو تین بار بلا ضرورت کوٹنا شروع کر دیا۔ کوٹنے پینے کی ان ناگوار آوازوں کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے گھر میں اپنے فرش پر مسل مار رہی ہے۔ دوسرے کے سر کی اسے پروا نہیں بعض لوگ اپنے بچوں کو کچھ ایسی تربیت دیتے ہیں کہ بچے پڑوسیوں کا صحیح معنوں میں جینا حرام کر دیتے ہیں۔ بچے پڑوسی کو کتنا تنگ کرتے ہیں اس بارے میں وہ ایک لفظ بھی سنا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ بچوں کی جھوٹی اور غلط شکایت کی جارہی ہے۔ اچھے پڑوسی وہ ہیں جو فدا سی شکایت لٹنے پر اصل بات کو جانیں بچوں کی غلطی ہو تو فوراً تسہیم کریں۔ لیکن اکثر لوگ منع کر کے کہے بجائے ان کی حرکتوں سے خوش ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی بچے کا ذکر ہے جو مختلف طریقوں سے اپنے قریبی تین چار پڑوسیوں کو تنگ کرتا ہے سب کی آنکھ بچا کر دوسروں کے گھروں میں کاغذ، ٹین کے

مکرمے کانٹے ڈالنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ موقع ملے پر وہ گھروں میں جا کر پھل پتوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ پڑوسیوں کے گھر کے سامنے کارخ کے ٹکڑے ڈالتا ہے۔ اور جب ان حرکتوں سے جی بھر جاتا ہے تو نظریں پکار اسکوٹرس کے ٹائرس میں کیلے بھی چھیجا جاتا ہے۔ وہ اور اس کے ماں باپ سراونجا کر کے چلتے ہیں۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان سے مرعوب ہیں۔ اس لئے کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ان غیر شانستہ حرکتوں سے محلے والوں کے پاس ان کا جو مقام ہیں وہ محلے والے ہی جانتے ہیں۔

بعض پڑوسیوں میں ایک دوسرے کو ستانے کا مقابلہ چلتا ہے۔ ایک صاحب کو گلے کا شوق ہے۔ وہ نہ صرف کلاسیکی موسیقی کا روزانہ دو گھنٹے ریاض کرتی ہیں بلکہ کچھ بچوں کو ساز کے ساتھ گانا بھی سکھاتی ہیں۔ اچھا خاصا گھر میوزک کالج کا سماں بیش کرتا ہے۔ پڑوس کچھ گلے سے مطلق دلچسپی نہیں۔ روزانہ سنتے سنتے اس کے کان پک گئے ہیں اس لئے جواب میں اس نے ایک فائو کتا پاں رکھا ہے۔ جس کو کم کھانا سے کر چھوٹی سی رسی سے تنگ باندھ کر رکھتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ بھونک کر گلے کا صحیح جواب دے سکے۔ لڑائی دو گھروں میں ہے لیکن دوسرے پڑوسی مجبوراً گانا سنتے ہیں اور کتے کی کرخت آوازوں کو بھی بھگتتے ہیں۔ دو پڑوسیوں کے بچوں میں کھیل کود میں لڑائی ہوئی۔ دو چار دن بعد بچے ایسے کھل مل گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا لیکن بڑوں کے دل میں ایک بار میل آجائے تو دھننا شکل ہے۔ ایک نے انتقاماً اس کا ایسا بندوبست کیا کہ دوسری کے گھر پانی آنا بند ہو گیا۔ تو تو میں میں، بڑھتے بڑھتے گالی گلوں کی فوبت آگئی دونوں نے ایک دوسرے کی سات پشتوں کو نوازا دیا۔ ایک کی چوٹی دوسری کے ہاتھوں میں تھی۔ کئی درفں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ تھک کر ایک نے دوسری پر مقدمہ دائر کر دیا۔ دونوں نے مہینوں کو رٹ کے چوک لکڑے

اور پھر دس دس روپے جمرانے پر دونوں سیدھی ہو گئیں۔ یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ دونوں خواتین شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اکثر خواتین کا اپنے پڑوسیوں کے گھر بہت زیادہ آنا جاتا ہوتا ہے۔ وقت بے وقت دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں۔ اور اطمینان سے اپنا وقت گزار کر واپس ہوتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ خود اگر بیکار ہیں تو ضروری نہیں کہ پڑوسن بھی بیکار ہو۔ بعض خواتین کو گھر گھر کے جلے لینے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ کسی گھر پھر کر ساری خبریں جمع کر لیتی ہیں پھر مریج نمک لگا کر اپنی پڑوسن کو سنا دیتی ہیں۔ کسی گھر کی ساس اپنی بہو کو طعنے دیتی ہے تو کسی گھر کی بہو اپنی ساس کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ کسی گھر میں پہلی تاریخ کو میاں بیوی میں زور دار جھگڑا ہوتا تو کسی کے بچے ماں باپ سے باغی ہو گئے ہیں محلے کے یہ سارے راز وہ اپنی پڑوسن کے پاس جا کر ایک ہی بیٹھک میں اگل دیتی ہیں۔ وہ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے۔

بے وقت آنے جانے کے علاوہ بعض لوگ مہمان کی آمد پر یا کسی وقت بھی کوئی چیز منگوانے کے لئے پڑوسی کا دروازہ بلا تکلف کھٹکھٹا لیتے ہیں۔ ہر ایک کے آرام کا ایک وقت ہوتا ہے اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھیں جن سے پڑوسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہو۔

ہر گھر میں ٹیلیفون نہیں ہوتا۔ پڑوسی کے ٹیلیفون کا استعمال ضرورت پڑنے پر بھی کرتے ہیں لیکن لوگوں کو چاہیئے کہ شدید ضرورت کے وقت ہی ٹیلیفون استعمال کریں۔ ایک صاحب صبح اچانک آفس چلے جاتے ہیں گیار بجے ان کی بیوی ہمارے گھر آکر فون کرتی ہیں 'راجو بکھر چلنے کھلنے صد کہ رہا ہے کس کا بھی ٹکٹے آئیے۔ اور کافی ختم ہو گئی ہے میں صبح کتنا بھول گئی! اس قسم کی باتیں کرتے وقت لوگ مطلق نہیں سوچتے کہ پڑوسی کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ

آفس سے شوہر بیوی کو فون کرتے ہیں۔ درمیان میں دو گھر ہوں تو جا کر انہیں بلانا ہوتا ہے وہ بے فکری سے ریڈیو کے ساتھ گاتے ہوئے کپڑے پٹک پٹک کر دھونے میں مصروف ہوتی ہیں۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھولتی ہیں انسان بن کر پارخ منٹ بعد فون کرنے آتی ہیں۔ شوہر سے مخاطب ہوتی ہیں۔ ادھر سے آواز آتی ہے "آج کھانا کچھ زیادہ بھیجنا، دہی رکھنا نہ بھولنا" اور ہاں..... مریح کم ڈالو۔ میں گھر میں کہنا ہی بھول جاتا ہوں۔ کبھی فون آتا ہے پڑوسن اکربات کرتی ہیں، دوسری طرف سے آواز آتی ہے "ہیلو بگم" میں پوچھنا چاہتا تھا کہ منا پٹھ رہا ہے یا نہیں؟ ایسی ہی شدید ضروری باتوں کے لئے لوگ پڑوسی کے گھر کا فون استعمال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایسے ہی فون پر ہم نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ "کیا کوئی ضروری بات کہنی ہے، کپ کو؟" اس وقت یہاں سے کوئی بلانے والا نہیں۔ جواب ملا۔ جی۔ جی ہاں۔ ضروری بات ہی تھی۔ میں اپنی بیوی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس وقت وہ کیا کر رہی ہیں؟ کوئی بات نہیں میں ڈپر کر پھر فون کر لوں گا۔

بہر حال ہسٹم کے پڑوسیوں سے لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ آپس میں تعلقات خوشگوار ہوں تو دونوں ایک دوسرے کے آرٹے وقت کام آتے ہیں اور تعلقات بگڑے ہوئے ہوں تو ایک کے گھر امبولنس آجانے پر بھی دوسرا مٹاشائی بنا دیتا ہے یا کھڑکی سے جھانک لینے پر ہی اتفاق کرتا ہے۔

# سولہ برس کا سن

عجمی ایک ایسا ساز ہے جسے خواتین بھر پھل میں بیٹھ کر چھڑتی ہیں۔ صرف عورتیں اپنی عمر چھپانے اور دوسروں کی بڑھا کر بتانے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں یہ گرمرد حضرات بھی خوب جانتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس سے واقفیت کا مظاہر کرتے ہیں۔ ایک صاحبہ جو تابلو ٹور جھوٹ بولتی ہیں ۳۰ سالہ لڑکے کی شادی کے وقت انہوں نے اپنی عمر ۲۲ سال بتائی۔ حساب کی ماہر خواتین نے احتجاج کیا کہ آپ بارہ سال کی عمر میں ہرگز ان نہیں بن سکتیں خدا کیلئے اپنی عمر میں چند سالوں کا اضافہ کیجئے۔ انہوں نے اپنی عمر تو نہیں بڑھائی البتہ بیٹے کی عمر یہ کہہ کر کم کر دی کہ اسکول میں شرکت کے وقت زیادہ لکھوائی گئی تھی۔ دانت نزلے سے گر گئے، بال دھوپ میں سفید ہو گئے، بینائی ویڈیو کی لعنت سے کم ہو گئی، ہم تو کہتے ہیں کہ مختلف جواز پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ عمر آخر عمر ہے بڑھتا اس کا کام ہے۔ اس قسم کی صفائیاں ہم خواتین کو زیب نہیں دیتی۔ یہ سوچ کر صبر کر لینا چاہیے کہ منہنگائی کی طرح عمر پر بھی ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ بعض لوگ کو قیو کی طرح غیر معینہ مدت تک کرسی پر جھجے رہنے کے لئے سولہ برس کے سن میں سولہ برس رہنا چاہتے ہیں جو نیرس عہدوں سے سبکدوش ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن سینئرس عمر کو برسوں روکے رکھنے کے فنی سے واقف رہتے ہوئے اپنی کم عمری کے مختلف ثبوت مختلف تھیں مسیں



میں دیتے رہتے ہیں

بعض غلامیں ضرورت سے زیادہ ہوشیاری بتانے کے لئے خود سے کم عمر ہم جماعتوں کا بار بار حوالہ دے کر بچھڑوں میں ملنا چاہتی ہیں۔ بس اسٹانڈ پر ایک صاحب نے دو چار کمسنوں سامنوں کے بعد ضروری سمجھا کہ منہ کھولا جائے۔ انہوں نے گریجویشن کا سنہ پوچھا۔ پھر تعجب میں بناوٹ گھول کر کہا "Se-Senior"۔

میں اتنی شدت تھی کہ زوردار سیٹی برقع گئی۔ قریب کھڑے ہوئے چند نوجوانوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ لیکن جیسے ہی سیٹی کی قدامت سمجھ میں آگئی ایک نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "آئی آپ تو سیٹی اچھی بچا لیتی ہیں۔" یہ صاحبہ ہر لحاظ سے سنہڑی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میٹرک کے بعد چند سال انہوں نے کالج کی صورت نہیں دیکھی ہوگی یا پھر ہر سالانہ امتحان کے وقت امتحان ہال کے بجائے میٹرٹی ہوم کا رخ کرتی ہوں گی

تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی کے وقت عمر کا سوال کھل کر سامنے آتا ہے۔ لڑکے والے میٹرک سے لے کر تعلیم کے سارے مدارج طے کر کے صحیح عمر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اب کل تو جہیز کی فہرست کے ساتھ مشاطہ میٹرک کے سرٹیفکیٹ کی کاپی بھی مانگنے لگی ہے۔ رشتہ ناپسند ہو تو اپنی طرف سے دو چار سال کا اضافہ ہی کر لیتے ہیں اور اگر پسند ہو تو پانچ دس سال زیادہ عمر والی لڑکی کو بھی بھونٹی قبول کر لیتے ہیں

"سر بڑا سردار کا" والی کہادت تو آپ نے سنی ہوگی۔ حال ہی میں ایک صاحبہ نے ایک خطرناک بات بتائی کہ بڑے کانوں والے لوگ طویل عمر پاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے پڑوس کی مثال دی کہ اس خاندان کے اکثر لوگ ۱۰۵ سال سے پہلے دنیا کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ ۹۰ سالہ آدمی کا تصویر یہی ہوتا ہے کہ وقت پر کھاتا پیتا اللہ اللہ کرتا ہوگا۔ اسر گھر کے ۹۰ سالہ چاچا کا زیادہ وقت جام کے درخت کی ڈالیوں پر گزرتا ہے "چاچا جام

پھینکنے" اس آواز کے وہ منتظر رہتے ہیں۔ پڑوس میں رہنے والی اس اوصیلر بھتیجی محمودہ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ ان کی عینک ہی بتا سکتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے محکم از کم مرحوم کی عمر صحیح بتائیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کسی کے انتقال کی خبر یا تصویر شائع ہوتی ہے تو تصویر دیکھ کر اجنبی لوگ کہتے ہیں کہ بیچارے کی بے وقت موت ہوئی یا ان کی عمر مرنے کی نہیں تھی اول تو موت کے ساتھ لفظ بے وقت کا استعمال ہی سراسر غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جان بوجھ کر جرائی کی تصویر شائع کی گئی تھی تاکہ مرنے کے بعد بھی لوگ ہمدردی کریں۔ دوسروں کو دھوکہ دے کر ہمدردی سمیٹنے کا یہ بھونڈا اہواز شریف متعلقین کو زبیر نہیں دیتا۔ ہمارا تو یہ ایقان ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں سچ بولنا چاہیے۔ خواہ بات عمر کی کیوں نہ ہو۔ انسان کی جہاں عمر بڑھتی ہے اس کے وقار کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ بعض خاص حالات میں طویل عمر کا ریکارڈ قائم کرنے کے لئے کسی مریض کی عمر راؤنڈ فیگر کر کے ۹۵ سے ۱۰۰ کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ چند ماہ قبل ایک ایرانی ہڈی کی عمر اس کی موت اور زیست کی کشمکش کے دوران ۹۵ سے ۱۰۰ برس کر دی گئی۔ یہ بتانے کیلئے کہ وہ اتنی بڑی عمر میں بھی موت سے ڈٹ کر پیچھے لڑا رہا ہے۔ مرنے کی عمر کے علاوہ ایک سرکاری عمر بھی ہے جو کسی انسان کے عہدے پر رہنے اور کام نہ کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ کبھی ایسا ہوا کہ صبح کسی نے اخبار ہاتھ میں لیا اور اسے پتہ چلا کہ بیٹھے بیٹھے وہ ۵۸ سے ۵۵ سال کا ہو گیا۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد وہ حاکموں کی بات رکھنے کے لئے پیرچ ۵۵ سال میں دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ سینیارٹی اور قابلیت کی بنیاد پر ترقی دینا ہر ایماندار حاکم کا فرض ہے۔ اس لئے کہ متعلقہ شخص کی عمر کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ جہاں کھلی دھاندلی اور نا انصافی ہوتی ہے وہاں اچھے اچھوں کو در خواست ہاتھ میں لے کر دم توڑتے بھی دیکھا گیا ہے۔

بھائی لوگ بیوی کے علاوہ سکرپٹری، نوکرانی اور اسی قسم کے مختلف کاموں کے لئے عورت کا انتخاب کرتے وقت اس کی عمر ضرور دیکھتے ہیں۔ میں اس مرد کو شاباشی دیتی ہوں جو آبروریزی کے لئے ۵ ماہ کی لڑکی کا انتخاب کرتا ہے اور باقی بھائیوں کو ایوارڈ کا مستحق سمجھتی ہوں جو جھوٹے منہ ہی سہی، کوئی جلوس نکالتے ہیں نہ بیان بازی کرتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے، ہمیں کیا پڑی۔ یہ ہوگی کسی کی لڑکی۔ وہ بھی صرف ۵ ماہ کی۔ رہیں بڑی اور منجھلی کرسیاں تو انہیں ان معمولی، چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا دلچسپی۔ ان کے ذہن بہت سے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔

آخری بات۔ بیوی تو ایک ہوتی ہی ہے۔ معزز حضرات دوسری عورتوں کی بھی گر کر، عزت کریں ٹوٹ کر چاہیں، ماں بہن اور بیٹی کے روپ میں۔ اگر ایسا ہوگا تو ان کے گھر کی عورتوں کی بھی وہی عزت ہوگی۔ چاہے وہ کچی کلیاں ہو یا کچی پیسی یعنی عورت، عورت ہے خواہ کسی عمر کی کیوں نہ ہو۔ اس کی عمر اور عورت پن کا استحصال نہ ہو، میں یہی چاہتی ہوں۔

# بہر کا دولہا

اُدھی ہندوستان کا ہو یا کسی اور دیس کا، گلے میں ہار ڈالے پھولوں سے سجی موٹر میں بیٹھ کر جب کسی لڑکی سے نکھر جاتا ہے تو وہ دولہا کہلاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اپنے دیس کا ہوگا تو صرف دولہا پکارا جائے گا۔ دیس کا نہ ہو تو یاہر کا دولہا ہوگا۔ یاہر کے دولہے دو وضع کے ہوتے ہیں۔ ایک مستقل وہیں کے رہنے والے، دوسرے وہ جو اپنے ملک سے تماشہ روزگار کی فکر میں نکلتے ہیں۔ انہیں یاہر سب کچھ مل جاتا ہے۔ سوائے دلہن کے اور اسی کی تماشہ میں پھر اپنے ملک آتے ہیں۔ مستقل یاہر رہنے والوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اچھی خصلت والے، بد خصلت والے۔ آجکل ہمارے دیس کے لوگوں کو ان دونوں قسم کے لوگوں سے بہت زیادہ سالہ پڑ رہا ہے۔

مستقل یاہر کر آئے والے دولہے کی خوبی یہ ہے کہ وہ لڑکی والوں سے کبھی قسم کی فرمائش نہیں کرتا بلکہ پوچھ پوچھ کر دیتا ہے کہ تمہیں کیا چاہیے۔ سسرال اور سسرال کے قریبی رشتہ داروں کے گھروں میں لائٹ لگا دیتا ہے۔ نل نہیں تو اس کا بھی معقول بندوبست کرتا ہے۔ کپڑے لٹے اور دولت کی باریش سے گھروں کا رنگ ہی بدل دیتا ہے۔ لیکن اگر بد خصلت بہر لڑکی کے ساتھ اس گھر کی ساری خوشیاں چھین لے جاتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب لڑکی کے عبور والدین اس کے بارے میں تحقیقات ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے پاس مانگنے والے

کو دینے کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہوتا وہ صرف اس کی جیبوں کو دیکھتے ہیں جو ڈالرس سے بھری ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہیں۔ یہ ہاتھ اٹھا کر رویہ تقسیم کرتا ہے۔ ایک ماہ عیش کر کے واپس چلا جاتا ہے، اس وعدہ پر کہ جاتے ہی لڑکی کو بلالے گا۔ جاتے وقت وہ ملی جلی عربی اور اردو میں روتا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی دلہن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر وہ ایسا بن جاتا ہے جیسے ہندستان آیا ہی نہیں تھا اور اگر آیا بھی تھا تو لفظ "شادی" سے اسے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ دوسری صورت میں لڑکی کر لے کر بھی جاتا ہے تو وہاں پہلے سے اس کی سوٹ موجود رہتی ہے۔ بعض مجبور اور کم عمر لڑکیاں تو اس کی عادی ہو چکی ہیں۔ ان کے ماں باپ بظاہر خوش نظر آتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کے فرض سے سیکدوش ہوئے اور گھر کا افلاس بھی گیا۔ ماہانہ آلے والے ڈھانٹ ہی ان کا سرمایہ زندگی ہوتے ہیں۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لئے وہ اپنے فرض سے سیکدوش ہو جاتے ہیں لیکن ان والدین اور لڑکیوں پر جو گذرتی ہے وہ ان ہی کا دل جانتا ہے۔

باہر سے آنے والے دوپے کی دوسری قسم وہ ہے جو اپنے وطن میں تعلیم پا کر روزگار کی فکر میں باہر جاتا ہے۔ وہاں جا کر وہ اپنے دیس کی بے مگری کی زندگی اور ٹھٹھ باٹ سب بھول جاتا ہے۔ وہ مشینی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شادی بھی اتہائی عجلت میں کرتا ہے۔ وہ اخبار میں اشتہار دلاتا ہے کہ صرف وہی لوگ رجوع ہوں جو پندرہ دن میں شادی کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ لڑکی والوں کو غیر ضروری دباغت کے چکر میں پڑنے کا بالکل موقع نہیں دیتا۔ ایک ماہر مشاطہ کے ذریعہ سرسری معلومات لینے کے بعد ایک گھرانے میں ایک لڑکے کا رشتہ طے ہو گیا۔ یہاں تک کہ نکاح کا دن آپہنچا۔ شادی خانے میں دھوم تھی دلہا دس کیلو فڈنی پھولوں کا سہرا باندھے شان سے موٹر سے اُترا۔ ایک چھوٹے لڑکے نے اما کا کہ دو لہا لنگڑا ہے۔ لڑکی والے بد ل گئے۔ جواب طلب کیا گیا۔ دو لہا تو بے چارہ دو لہا

تھا۔ اس سے یہ منظر دیکھنا نہ گیا۔ وہ موٹر کے پھول اور گدہ کا ہار اپنے والد کے منہ پر پھینک کر واپس چلا گیا۔ ادھر لڑکے کے والدین سے دھوکہ دہی کی وجہ پر چھی گئی تو اُلٹے برس پڑے کہ ہم نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ رہا لڑکے کے لنگڑے پن کا سوال تو سچ یہ ہے کہ آپ پوچھے نہیں ہم بولے نہیں۔ بڑی مشکلوں سے براتی دہن والوں کی طرف سے آئے ہوئے بے قصور جہانوں سے لڑا جھگڑ کر واپس ہو گئے۔ آٹھ دن بعد باہر سے آئے ہوئے اس لنگڑے دولہے کی دوسری لڑکی سے خیر خوبی کے ساتھ شادی ہو گئی۔ خوش قسمتی سے یہاں جوڑے کی رقم بھی کچھ زیادہ ہی ملی، لڑکی کی صرف ایک آنکھ خراب تھی اور اونچا سننتی تھی۔ لنگڑے دولہے کے باپ نے دھوکہ دہی کا الزام لگایا۔ لڑکی والوں کا صاف جواب تھا۔

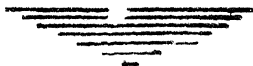
”آپ پوچھے نہیں، ہم بولے نہیں! قصہ ختم۔“ اس شادی سے کم از کم ان لوگوں کو آئندہ کے لئے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ شادی بیاہ لین دین کے معاملے میں صاف اور کھل کر بات چیت کریں۔ رویہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ کبھی کسی ایک کے پاس رہتے والا نہیں۔ لڑکے والوں کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ اگر وہ ہزاروں کی رقم طلب کریں گے تو لڑکی کے جمہور والدین کہاں سے دیں گے۔ آج کل تو ایک قسم کا مقابلہ سا چل رہا ہے۔ اکثر سرپرست جن کے پاس کثیر دولت جمع ہے خواہ وہ حرام کی ہو یا حلال کی، پیشکش کرتے ہیں کہ یہ پچیس ہزار روپے جوڑے کے دیں گے۔ پندرہ تو لے سونادیں گے اور لڑکا چونکہ باہر ہے اس لئے مزید پندرہ ہزار روپے فریچر وغیرہ کے لئے دیں گے۔ یہ لوگ لڑکے والوں کی عادتیں بگاڑ رہے ہیں اگر لڑکی والے بلکہ خود لڑکیاں مصمم ارادہ کر لیں کہ باقاعدہ مانگنے والوں کا بائیکاٹ کریں گی تو بہت جلد سماج سے جوڑے گھوڑے اور چھیز کی لعنت ختم ہو سکتی ہے۔

آج کل بہت سے لڑکے ملک سے باہر ہیں ان کے والدین جو یہاں ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا لڑکا چونکہ بہت زیادہ دولت کما رہا ہے اس لئے اسی تنا سب سے لڑکی والوں سے جوڑے کی رقم کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ بعض صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ لڑکی والوں سے لی گئی یہ رقم اور اس کے حساب کتاب سے لڑکا قطعی ناواقف رہتا ہے۔ وہ اس رقم کی پرواہ اس لئے نہیں کرتا کہ وہ خود بے حساب دولت کا مالک رہتا ہے۔ جوڑے کی رقم کا مطالبہ لڑکا نہیں کرتا بلکہ اس کے والدین خصوصاً مائیں کرتی ہیں۔ انہیں روپے کی ایک ہوس سی ہوتی ہے۔ ہر طرف کا رویہ یہ ہونا چاہتی ہیں۔ لڑکے سمجھ گئی سے اپنی ماؤں کا بائیکاٹ کریں جو جوڑے کے نام پر ہزاروں کی رقم لڑکی والوں سے لیتی ہیں۔ اور ایک معنوں میں اپنے لڑکوں کو نہ بچتی ہیں۔ اس بائیکاٹ کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ماؤں کو تنبیہ کر سکتے ہیں جوڑے کے نام پر رقم لی جائے گی تو وہ انہیں بنک ڈرافٹ بھیجنا بند کر دیں گے۔

صحت مند فقیر کسی کے در پر جا کر بھیک مانگتا ہے تو لوگ غصہ میں آکر طنز یہ کہتے ہیں کہ ہٹا کٹا ہے مگر بھیک مانگ رہا ہے۔ میرے نزدیک ایسے لوگ ان فقیروں سے بدتر ہیں جو علانیہ اخبار میں اشتہار دے رہے ہیں کہ ایسی لڑکی کو ترجیح دی جائے گی جس کے والدین لڑکے کو باہر بھجوانے کی پوری ذمہ داری لے سکیں۔ ایسے لوگ سماج کے نام پر بد نما داغ ہیں۔

مختلف مقامات سے ایسی اطلاعات مل رہی ہیں کہ لڑکی کو اس کے سسرال والوں نے محض اس لئے کیر و سین ڈال کر زندہ جلا دیا کہ وہ جہیز کم لائی تھی۔ یا جتنے مطالبات ان لوگوں نے کئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ کیر و سین ڈال کر نہ بھی جلائیں تو یعنی سسرال والے لڑکی کو گلے دے دے کہ زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا

آجاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی بدسلوکی اور طعنوں کی تاب نہ لا کر خودکشی کر بیٹھتا ہے۔  
 بہر حال سماج کی بڑھتی ہوئی اس لعنت کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کو  
 ختم کرنے میں خوشحال لوگوں کو تھوڑی سی قراقلی سے کام لینا ہوگا۔ خصوصاً  
 وہ لڑکے جو ہندوستان سے باہر ہیں ان کے سہرے کے پھول جب کھلیں تو وہ  
 حسب استطاعت کچھ رقم ایسی مستحق لڑکی کے لئے فرور دیں جس سے اس کے  
 ہاتھوں کو بھی ہندی لگ سکے اور دوسری خوشحال لڑکیوں کی طرح اس کا  
 گھر بھی بس جائے۔





# ہزاروں خواہشیں

ہر انسان کے دل میں کچھ نہ کچھ خواہشیں ضرور ہوتی ہیں۔ یہ اور بات کہ قسمت  
 ساتھ دے تو انسان کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔ اور اگر پیدا کشتی قسمت پھوٹی ہو تو  
 خواہشوں کے لئے وہ اس دنیا سے کافی سے خاموش چلا جاتا ہے۔ ایک صاحب کی خواہش  
 ہے کہ وہ کبھی نہ مریں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو وہ موت سے ڈرتی ہیں، دوسرے یہ  
 چونکہ وہ دس سال سے ساٹھ سال پر رکھی ہیں۔ اس لئے ان کی عمر ابھی مرنے کی نہیں ہے۔ انہوں  
 نے اپنی ایک ڈاروان سے کہہ دیا کہ اتفاقاً اگر وہ مر بھی جائیں تو مرنے کے بعد کم از کم دس گھنٹے  
 ویسے ہی رکھا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ دس بارہ گھنٹے بعد سانس پھر واپس آ سکتی ہے۔ انہیں  
 اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ وہ بے فکری سے اپنی جان دے  
 سکتی ہیں۔ اس لئے کہ تجبیز و تکفین کا انتظام ہونے اور دوست احباب، رشتہ داروں کو  
 اطلاع دیتے تک دس گھنٹے گزر رہی جاتے ہیں۔ ان کی بعض عجیب و منفکہ نیز خواہشات کی  
 تفصیل سن کر ایک انجان آدمی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ محض لوگوں کی مسلسل توجہ اور  
 ہمدردی حاصل کرنے کے لئے وہ کبھی اندھی بن جاتی ہیں تو کبھی لنگری۔ وہ کیا سوچتی ہیں،  
 کیا چاہتی ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے کہ وہ بیمار نظر آئیں  
 روزانہ دوچار لوگ ان کی مزاج پر سی کو آتے ہیں، وہ تندرست ہیں پلٹتی پھرتی ہیں پھر بھی  
 وہ چاہتی ہیں کہ بیمار کہلائیں۔ لوگوں کی ہمدردی سمیٹنے کے لئے وہ گرنے کی بھونڈی کھانسی

کرتی ہیں پھر اس کا ڈھنڈورا بجتی ہیں، اس پر بھی توجہ نہ ملے تو وہ ننگرا کر چلنا شروع  
 کر دیتی ہیں۔ لیکن چال کو دھما کر نا بھول جاتی ہیں۔ اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرنے کی  
 خواہش میں وہ سامنے رکھی چیزوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی ہیں۔ پھر تنہائی میں سب کی نظریں  
 بچا کر پیسے گنتے وقت وہ بھول جاتی ہیں کہ انہوں نے جس چیز کی خواہش کی تھی اس کے خلاف  
 کام کر رہی ہیں۔ ایسی صورت میں دیکھنے والے ان پر فخرے کستے ہیں، ذاق اڑاتے ہیں اور کہتے  
 ہیں کہ ایسی خواہش پوری کرنی ہوں تو کم از کم یونا انٹی ٹیوٹ میں کچھ عرصہ کر ایک لک سکھ لیں تاکہ جگہ نہ  
 بہو کی تلاش میں نکلنے والی خواتین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے گھر بہو بن کر آئے والی  
 لڑکی میں تمام گن موجد ہوں یعنی مالدار، دراز قدر، خوبصورت، نیک سیرت، پڑھی لکھی اور صوم و صلواۃ کی  
 پابند۔ پریوں جیسی بہو کی خواہش رکھنے والی ساس کے لڑکے کو دیکھیں تو وہ ہوگا توڑے کے  
 چپکے کا چاند، منہ کھولے گا تو ایک دانت بھی صبح جگہ پر نہ ہوگا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ وہ  
 خوبصورت یہو کو حاصل کر ہی لیتا ہے۔ ایسے جوڑے کو دیکھ کر دودھ پیڑے اور مکوڑے کا خیال  
 ایک ساتھ آتا ہے۔ میری ایک دور کی رشتہ دار کہہ رہی تھیں کہ اپنے لئے ایسا داماد ڈھونڈ رہی ہیں  
 جو جاذب نظر، لکھ جی اور اکلوتا ہو۔ اور کم از کم دو موٹریں رکھتا ہو۔ تاکہ ان کی بیٹی جس وقت  
 بیاہے میکے آ سکے۔ ایک سال بعد اتفاق سے ان کے گھر دوبارہ جاتا ہوا۔ ایک چھک زدہ بیست قد  
 آدمی آٹو والے سے جھگڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوا معلوم ہوا کہ وہ ان کا مثالی داماد تھا۔  
 ایک صاحبہ کو الٹیاں ہوتی تھیں اور وہ نڈھال ہو کر گرتی جاتی تھیں، انہوں نے  
 ٹھیک سے وضاحت تو نہیں کی کہ انہیں جو الٹیاں ہوتی تھیں وہ ہاضمہ کی خرابی سے ہوتی تھیں  
 یا لال ٹکوں کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ بہر حال جو بھی ہو، ان کی خواہش تھی کہ انھیں الٹیاں ہوں  
 اور نہ ہی فوبی ہو ان کو سنبھالے اور فرش وغیرہ کی صفائی کئے بہو کو لال ٹکوں دیکھنے کی ابھی قطعاً ضرورت  
 نہیں تھی۔ ساس کی خطرناک حالت دیکھ کر بہو قریب آنے کے بجائے دھبھا گئے پر جمی رہی۔

یہ ہونے لگا۔ ساس کی خواہشوں پر پانی پھیر دیا تو ساس نے ایک ماہ میں اعلان کر دیا کہ بہو نافرمان  
 اور گستاخ ہے۔ اب یہ حال ہے کہ وہ اسکی صورت سے نفرت کرنے لگی ہیں۔ بیٹے کو مشورہ دے  
 رہی ہیں کہ بیوی تو دوسری مل سکتی ہے، ختم دینے والی ماں کا بدل ناممکن ہے۔ اس نافرمان بہو کو  
 فوراً طلاق دو اور میری پسندیدہ خدمت گزار بہولے آؤ۔ میری خواہش پوری نہ کرو گے تو میں دودھ  
 نہیں بخشوں گا۔ اوٹ پٹانگ خواہشات کی عدم تکمیل پر دودھ نہ بخشنے کی دھمکی؛ یہ کتنی بڑی جتنی اور لمبی  
 دھمکی ہے۔ ٹیپے کا دودھ پینے والے بچوں کو ماں کا دودھ نہ بخشوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دولت  
 پر دم دینے والوں کی خواہش بھی قابل ذکر ہے۔ روپیہ جن لوگوں کی کمزوری ہوتا ہے۔ ان کی خواہش  
 ہوتی ہے کہ جب تک زندہ رہیں کم سے کم خرچ میں اپنا گزارہ کریں۔ اور روپیہ سنبھال سنبھال کر  
 رکھیں۔ ایک صاحب تھے جنہیں دولت سے والہانہ محبت تھی۔ بچوں پر روپیہ تو خرچ کرنا  
 بہت دور کی بات ہے وہ اپنی غذا اور دوا پر بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سنا ہے کہ ان کی  
 بیماری کے زمانے میں ان کی بیٹی اور نو ساسا تو اسی کچھ دن کے لئے ان کے گھر گئے تو وہ اس  
 ٹکڑی دے دیے ہونے لگے کہ گھر میں دال چاول کے ڈبے خالی ہو رہے ہیں۔ طاقت کے لئے ڈاکٹر  
 نے انہیں سیپ کھانے کی تاکید کی تھی۔ پیسے کی پخت کی خاطر وہ دن بھر میں بمشکل سیپ کے  
 دو تین ٹکڑے کھاتے تھے۔ صبح اٹھتے ہی کالے دھن کو دیکھ لیتے اور جی ہی جی میں خوش ہوتے۔  
 ایک دفعہ بارش کا پانی گھر میں داخل ہو گیا سارے نوٹ بھگ گئے۔ کئی دن ان کا مشغہ رہا کہ روزانہ  
 سامنے بیٹھ کر اپنی نگرانی میں نوٹ خشک کرواتے اور دکھا دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کی  
 تمام خواہشات ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف یہی ایک خواہش مرتے دم تک ان کا ساتھ دیتی ہے کہ روپیہ جمع  
 رہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہیں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کا دم بھی مشکل سے نکلتا  
 ہوگا کیونکہ وہ آخری سانس تک یہی سوچتے ہوں گے کہ مرتے کے بعد ان کی جمع شدہ دولت کا کیا  
 ہوگا۔ جو لوگ *Sadism* کا شکار ہوتے ہیں وہ عجیب مضحکہ خیز خواہشوں کو دلوں میں لئے

زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بے بس، بے کس مصیبت زدہ نہ ہوں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ سر بھر کتبہ رکھتے ہوئے بھی روتے پھرتے ہیں کہ ان کا کوئی نہیں، اولاد کی بہت زیادہ اطاعت گذاری کا اکتھال کھتے ہوئے بھری غفلتوں میں اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی موت مٹی اولاد کے پیسوں سے نہ کی جائے۔ ان سے یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ زندگی میں جو کھایا پیادہ کدھر گیا۔ چلتے چلتے میں اپنی خواہشات کا بھی ذکر کروں، میری دلی خواہش ہے کہ غم سب کے نام پر فساد نہ ہو۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہمیشہ برقرار رہے۔ اس خواہش کو پوری ہوتے دیکھ کر میں پھولے نہیں سکتی۔ کبھی کبھار خدائے عناصر مذہب کی آڑ لے کر، فساد برپا کروانا چاہتے ہیں تو میں ان قبرستانوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں جہاں دو مختلف مذاہب کے لوگ برابر میں مدفون ہیں۔ رسول کا ساتھ ہے، یہ کہیں بھگڑا کھڑا نہیں کرتے۔ میری خواہش ہے کہ جوڑے کی رتم اور جہیز کی فہرست کا مطالبہ کرنے کی لعنت بالکل ختم ہو جائے۔ اور کوئی لڑکی اس مجبوری کی وجہ سے کنواری نہ رہے میری یہ بھی خواہش کہ خدائے اماندے کے میں کسی مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹنے دوں۔ خدا سے رو بدل کے ساتھ یہ شعر ہمیشہ میری زبان پر رہتا ہے ۔

دیتی ہی جلی جاؤں ہر شخص کو جو مانگے تو اپنے خزانے سے یارب مجھے اتنا دے

کبھی کبھی دل میں بے نیکی خواہش گھر کر لیتی ہے۔ علی الصبح اخبار ہاتھ میں لیتے ہی میں دیوانہ وار صفحے الشما شروع کر دیتی ہوں کہ کہیں میرا نام پڑھنے مل جائے۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنی موت کا تماشہ دیکھوں۔ جلی حرفوں میں اپنے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھوں۔ مختلف لوگوں کو مختلف انداز سے اپنی موت پر آنسو بہاتے دیکھوں پھر..... دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آتا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی خواہش ہے جو زندگی میں پوری ہو سکتی ہو۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے مجھے ہمارے سے مرے بتانا ہو گا۔ فی القوت تجھ میں یہ ہمت نہیں ہے اس لئے انجان ہو جانا ہی بہتر ہے۔

# خوش رہنا بھی ایک فن ہے

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں

”تیونس کے صدر حبیب بورقیبا کا قول ہے۔

”جو انسان اپنے پرہیز سکتا ہے وہی خوش و خرم رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہنسنے کے مواقع کی اس کے لئے کوئی کمی نہیں۔“ انسان کو حیوان ظریف کہا جاتا ہے۔ ظرافت اور خوش طبعی کے بغیر انسانی زندگی کے مکمل ہونے کے بارے میں سوچنا بہت بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کی زندگی سکونِ دل اور خاطرِ جمعی کے ساتھ گزرتی ہے وہ نہ صرف اپنے آپ سے خوش رہتے ہیں بلکہ خوش کلامی ان کا شعار ہوتا ہے۔ خوش رہنے کے لئے انسان کو زندہ دل رہنا ضروری ہے۔ میں ایک صاحب کو جانتی ہوں، خدا ان کی عمر دراز کرے، دس سال بعد عمر کے سو سال پورے کرنے والے ہیں آہستہ آہستہ مکھ اور زندہ دل ہیں۔ وقت خوش گزرے ان کا مسلک ہے۔ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے تاش کے پتے جاسے، ریڈیو پر فلمی گانے لگائے مست بیڑے رہتے ہیں۔ وقت پر عبادت، وقت پر کھانا، کوئی ملنے آجائے تو ایسی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں، ایسی باتیں شروع کر دیتے ہیں کہ گفتگوں سیٹھ رہیں وقت کا پتہ نہ چلے۔ گزشتہ سال انہوں نے بذریعہ ریل پاکستان کا سفر کیا۔ ایسی پر ملاقات کے دوران میں نے کہا آپ ضیف و نواتواں ہیں، ریل کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے، آپ کو چاہیے تھا کہ ہوائی جہاز سے جاتے کچھ ہی دیر بعد میں نے یاد دلایا ”آپ کے بچے اللہ کے فضل سے اچھے خدوں پر فائز ہیں

وہ ٹکٹ کا انتظام کر سکتے تھے۔ اس پر انہوں نے زوردار تہقیر مارا کہتے لگے۔ ”وہ اور ہوائی جہاز کا کرایہ ان لوگوں نے تو مجھ سے میری سوزنی جین لی۔“ ان کی ایک ضعیف سالی ہیں۔ باتوں باتوں میں ان کی بیماری اور چلنے میں معذوری کا ذکر آیا۔ کہتے لگے ”اسی لئے میں کچھ رہا ہوں کہ مجھ سے نکاح کر لیں، ضعیفی کا سہارا بنوں گا لیکن مانتی ہی نہیں۔“ ان کی دلچسپ باتیں سن کر میری بھی لطف اندوز ہوتی ہیں۔

کسی انسان میں قنوطیت ہو، ماحول سے برہمی ہو تو وہ مسلسل دنیا سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی جلی بھنی صورت دوسروں کو دنیا سے بیزار کر دیتی ہے۔ اس کے ہر چلے میں نہر خند ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو دعا دیتا ہے تو یوں کہتا ہے ”سدا خوش رہو“ یا ”خدا تمہیں خوش و خرم رکھے“ لیکن یہ دعا اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جبکہ دعا پانے والا واقعی خوش رہنا پسند کرے۔ پڑ پڑا، بدمزاج انسان نہ خود خوش رہتا ہے نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ حد یہ کہ وہ کسی کو خوش دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس قسم کے لوگوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ گھر میں کوئی جہان آئے تو اس سے ایسے جل مکھ پن سے پیش آئیں گے کہ وہ دوبارہ آنے کا نام نہ لے۔ گندھی پیٹ تفریح کے لئے جائیں تو منہ پھلا کر بیٹھ جائیں گے اور سارے لوگوں کی خوشیوں پر گندھی پیٹ کا پانی پھر دیں گے۔ صبح سویرے ایسے لوگوں کی افلاں بھری صورت پر نظر پڑے تو سارا دن خوف میں گزر جائے۔ مکان بنانے والے، نل لائٹ والے سے لے کر کام کرنے والے کو کوسنے سنانا ان کا معمول ہوتا ہے۔ ہمیشہ بھٹائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ کھاتے پیتے اور روتے کے روتے رہتے ہیں وہ نہیں جانتا چاہتے کہ خوش رہنا کس چیز کا نام ہے۔ وہ بھلے، ان کی بدمزاجی بھلی، دوسرے جائیں بھڑیں۔

جو لوگ خوش دل ہوتے ہیں وہ ہر محفل میں سر اٹھکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔

پڑوسی، رشتہ دار، دوست احباب سبھی ان سے ملنے کے آرزو مند ہوتے ہیں خوش طبع آدمی کسی محفل میں پہنچ جائے تو وہ اپنے مخصوص تسکنت انداز سے محفل میں جان ڈال دیتا ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقاریب میں وہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ غم دورا

اور غم جاناں کو سینے سے لگائے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنے ملنے والوں سے کبھی ان مشکلات کا ذکر تک نہیں کرتے جس میں وہ زندگی بھر گھرے ہوتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی کا بندوبست نہ ہو تو وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ پریشان کن بیماریوں کو وہ آزمائش کہہ کر جھیل لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف دنیا میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی موجود ہیں جو کسی حال میں خوش رہنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی ساری نعمتیں لا کر ان کے قدموں میں ڈال دیں، وہ روپے کے پیرامیسری نوٹ پر لکھ دیں کہ آپ کی جھوٹ موٹ کی ساری بیماریاں ہم لینے تیار ہیں، اپنی عمر کے باقی سال آپ کے ۷۷ سالوں میں جمع کرنے کا عہدہ کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ خوش نہیں ہوں گے۔

یہ کچھ ہے کہ خوش رہنا بھی ایک فن ہے۔ اس فن میں مہارت حاصل کرنا بہت آسان ہے بشرطیکہ انسان سنجیدگی سے ملے کمرے کہ وہ خوش رہے گا جو لوگ ہمیشہ اپنے اوپر غور دگی اور مصیبت زدگی کی کیفیت طاری کئے ہوتے ہیں، ان کے لئے مل چھ کار آمد اور زود اثر نسخے پیش کر رہی ہوں وہ اسی وقت نوٹ کر لیں، بقیہ زندگی کام آئیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ پہلی فرصت میں وہ اپنے چہرے سے افسردگی اور غمزدگی کا جھوٹا نقاب نکال پھینکیں گے جو انہوں نے جان بوجھ کر چڑھا رکھا ہے۔ سب سے پہلے بیماری کو لیجئے برائے نام بلڈ پریشر میں مبتلا رہنے والوں کو چاہیئے کہ ان مریضوں کو دیکھیں جو کیفیر دق، گھٹیا، فالج، دہر جیسے تکلیف دہ امراض میں مبتلا ہیں۔ یہ سوچ کر خوش رہیں اور اللہ کا شکر

اداکریں کہ وہ نوجوانوں سے زیادہ چاق و چوبند ہیں، کھانا اچھا خاصا ہضم ہو جاتا ہے۔  
 بیٹائی اور ٹی وی میں گہری دوستی ہے اور اب کیا چاہیے؟ روتی صورت بنائے، ناخوش  
 رہنے والوں کے لئے میرا ایک نیک مشورہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمتر اور چھوٹی چیزوں پر نظر رکھیں  
 کسی کو اگر شکایت ہے کہ گھر چھوٹا ہے، گنجائش کم ہے، چلتے پھرتے دیواروں سے ٹکریں لگتی  
 ہیں تو ناخوش اور شاکی رہنے کی بجائے ان ہزاروں افراد کو دیکھیں جن کے لئے ”گھر“  
 نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بے شمار لوگ ایسی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو دھوپ اور  
 بارش سے بھی نہیں بچا سکتیں۔ کسی کو اگر شکایت ہے کہ ہاتھ میں روپیہ کم ہے تو وہ ایسے  
 نناننان سے اپنا مقابلہ کر کے خوش رہے جس کے پاس مستقل آمدنی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ ہو۔

خوش نہ رہنے کے مواقع مردوں کے مقابلوں میں عورتوں کو زیادہ نصیب ہوتے ہیں۔  
 مرد زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہو جائے تو وہ کافی، چائے یا  
 کچھ اور پی کر توقع سے زیادہ خوش و خرم گھر لوٹتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض عورتیں تو ناخوش  
 رہنے کے گویا بہانے ہی ڈھونڈتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیٹا اپنی بیوی یعنی ان کی بہو کو لے کر  
 پیکر چلا جائے تو ان کی خوشیاں ختم۔ بہو تین سال لگاتار تین لڑکیوں کو جنم دے تو وہ بہو  
 سے ناخوش۔ ایسے نازک موقع پر ناخوش ہونے والوں سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ لڑکی کی پیدائش  
 پر منہ پھلائے بیٹھی ہیں تو خود لڑکا بن کر کیوں نہ پیدا ہوئیں۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خوش تو رہتے ہیں لیکن ان کے خوش رہنے کی  
 وجہ بڑی ترالی ہوتی ہے۔ یعنی یہ لوگ حسد کی آگ میں جل کر کسی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے  
 ہیں۔ شاہ جہاں کے دور کا واقعہ لیجئے۔ شیخ سرمد کی گرفتاری کے وقت بہت سے لوگ ایسے  
 تھے جو رو رہے تھے لیکن بہت سے ایسے تھے جنہیں خوشی ہو رہی تھی۔ شیخ سرمد نے انہیں کوئی  
 نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ ان کے خیالات کو سمجھتے بھی نہ ہوں گے پھر بھی انہیں خوشی تھی کہ



شیخ سرمد گرفتار کر لئے گئے اور شہید کر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح ہر دور میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جنہیں یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کوئی مخالفت اور اس کو تکلیف پہنچا کر خوش ہو سکیں۔ مخالف نہ بھی ملے تو مخالفت کے اسباب وہ خود بنالیتے ہیں۔ کسی افسر کو اس کے ماتحت کام کرنے والے کی طرف سے جھوٹ موٹ کی باتیں بنا کر بدظن کروا دیتے ہیں۔ کسی کی شکایت کر کے اس کی ملازمت میں خلل ڈالتے ہیں اور بے حد مسرور ہوتے ہیں۔ مبالغہ اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کسی کو بدنام کر کے سمجھتے ہیں کہ دنیا کی ساری خوشیاں اُن کی جھولی میں آگئیں۔ ایسے خوش رہنے والوں کو دور سے سلام۔ ہمیں تو ایسے لوگوں سے کام ہے جو خود بھی خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش دیکھ سکتے ہیں۔

# ہم چٹپٹاں ہوئے جھوٹ لوگ

جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے۔ بہت کم لوگ اس فن میں کامل مہارت رکھتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ جھوٹ بولتی ہیں۔ ایک صاحب نے جھوٹ بولنے کی وجہ یہ بتائی کہ انہیں بچپن ہی سے یہ تربیت ملتی رہی کہ جھوٹ کہو جھوٹ کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ مثلاً ان کے عمیں میں ایک دفعہ ان کی والدہ سینا دیکھنے نکل گئیں۔ اور تاکید کر گئیں کہ ان کے جانے کے بعد کوئی گھر آئے تو سینما کا ذکر ہرگز نہیں کرنا بلکہ یہ کہنا کہ والدہ دواخانے گئی ہیں۔ اتفاق سے کوئی رشتہ دار آگئے انہوں نے ابتداء میں تو کہہ دیا کہ والدہ بیمار ہیں۔ دواخانے گئی ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے یہاں کچھ ایسے انداز سے سوال کیا کہ انہیں چک چکا اور سرخ بات کہ دی۔ اس ایک جھوٹ کے لیے بیماری کو دو طرفہ فائنٹ سنی پڑی۔ ایک طرف سے تو جھوٹ کہنے پر اور دوسری طرف سے جھوٹ کو قائم نہ رکھنے پر۔

ایک صاحب جو قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے زندگی بھر کسی اسکول کی عورت نہیں دیکھی اپنے آپ کو نان میٹرک بنزس میں کہتے ہیں۔ جھوٹ کہنا شہنی بگھا رانا اور ڈینگ رانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ محلے کے لوگ انہیں جھوٹا لپائی اور جھوٹوں کا بادشاہ کہہ کر بلا لے ہیں۔ حیدرآباد کا نوابی دور ختم ہو گیا لیکن نوابی ذہن رکھنے والے اب بھی باقی ہیں۔ یہ صاحب اسی قسم کا ذہن رکھتے ہیں۔ حیدرآباد میں چائے پانگہ پیالی اٹھا کر رکھنا شان کے خلاف سمجھتے

تھے۔ باہر جا کر دوسروں کی جھوٹی بیابان دھو رہے ہیں۔ کچھ دن قبل اپنی ایک تصویر بھولی  
جس میں بہت ہی قیمتی ٹیڑھا کار میں شان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بھرلیک دن ایسا کیا جھوٹ پر سے  
پرودہ اٹھا۔ وہ موٹر میں تو روز بیٹھے تھے لیکن پھلی سیت پر کاؤ کا مالک بھی بیٹھا تھا۔  
یہ کوئی نئی بات نہیں ہے دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی نے ایک شخص سے سوال  
کیا "کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟" اس نے جواب دیا "جی نہیں" "شراب کے عادی ہو جی نہیں؟"  
جوا کھلتے ہوئے۔ "جی بالکل نہیں"۔ تب تو تم میں کوئی بولتی نہیں۔

اس شخص نے کہا صرف ایک برائی ہے، میں جھوٹ بہت بولتا ہوں۔  
بقول ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور "معصوم قسم کی سخی اور دن تواری کے ساتھ جب کوئی آپ بیتی  
سناتا ہے تو اسے پورا مانا کہتے ہیں۔ بے معنی باتیں جو مبالغے سے بھری ہیں بھنڈی کہلاتی  
ہیں۔ بھنڈی روزمرہ کی زندگی میں ایک ضروری فن ہے۔ گفتار ہر عورت کے ساتھ  
عاشق اپنی محبوبہ کے سامنے، شوہر اپنی بیوی سے عادتاً بھنڈی کا سہارا لیتا ہے۔

آدمی اپنی حیثیت اور ہاضمے کے مطابق جھوٹ بولتا ہے۔ چھوٹے عورتوں کے دکاندار سے  
فکر بڑے سے بڑا کاروباری آدمی جب موقع جھوٹ بولنے سے گریز نہیں کرتا اس طرح وہ  
اپنی جائز آمدنی میں اضافہ کرتا ہے۔ مٹھائی فروش عموماً تازہ مٹھائی کے ساتھ باسی رکھ دیتا اپنا  
دبان سمجھتے ہیں۔ بعض وقت کسی مخصوص مٹھائی کے بارے میں ان سے استفسار کیا جائے تو  
وہ اس قدر اطمینان اور یقین کے ساتھ جھوٹ کہہ دیتے ہیں کہ ان کے جھوٹ کو سچ مان کر  
بہت زیادہ شریف لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کا طریقہ کاریہ یہ ہوتا ہے کہ مٹھائی باسی ہو کر  
پرودے اعتماد کے ساتھ ایک ٹکڑا طشتری میں رکھ کر آگے بڑھاتے ہیں کہ چکھ کر دیکھ لیجئے  
اس طرح وہ جھوٹ بول کر پشیمان ہوتے ہیں نہ پریشان۔ اس چال میں صرف وہی لوگ  
نے میں ہو چکے ہیں بچکا سرف اور شرم محسوس کرتے ہیں۔ ورنہ عموماً ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ

خوش پوشاک لوگ دکان پر جلتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ دو چادر قسم کی میٹھالیوں کے تارہ یا باسی ہونے کے  
تعلق سے پوچھ لیتے ہیں۔ دکاندار یہ سمجھ کر کہنا لگا کہ ایک ہے۔ سوگرام میٹھا چکا دیتا ہے۔ میاں بیوی  
دونوں دکان پر جائیں تو دو سوگرام چٹ کو کے نفاس سے دستی سے منہ صاف کر لیتے ہیں۔ اول  
بچوں کے لیے یا ایک پائے کیلو جلیبی یا لذو خرید کر چلتے پھرتے نظر کرتے ہیں۔ ایسے مناظر بڑے دلچسپ  
اور دلکش ہوتے ہیں ہم اکثر میٹھالی کی دکانوں پر محض ان ہی دلکش نظاروں کی دید کیلئے جاتے ہیں۔  
ایک میکی سے ہم نے کسی پفیس خریدی۔ کاذنر پر کھڑے بچے سے پوچھا "تازہ ہیں نا؟"  
اس نے دھناتی سے کہا جی ہاں! بالکل تازہ ہیں قین نہ آئے تو چکھ کر دیکھ لیجیے۔ بیک ٹکڑے  
دقت ہم نے پھر زور ڈال کر پوچھا دیکھو۔ تازہ ہے جی میں نا؟ اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے  
دھیے لیجیے میں رکھتے ہوئے کہا جی ہاں تازہ ہیں صبح کے بنے ہوئے ہیں۔ پیسے دیتے ہوئے ہم نے  
تیسری مرتبہ پھر پوچھا۔ باسی تو نہیں؟ درنہم واپس لائیں گے دکاندار نے نگاہیں نیچی کر لیں۔  
مریل آڈا میں "ولا" کل کے بنے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم دکاندار کو جھوٹ سے روکنے اور سچ  
انکوائے کے لیے کسی کے پاس اتنا دقت کہاں سے آئے گا۔ یوں ہی بہت سے دکاندار ایک دوسرے کو جھوٹ  
بول دینے کے بعد اسکو برقرار رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ اب یہ سوالات کئے جائیں تو کھرا جواب دے  
دیتے ہیں۔ "جہاں اچھا لگا ہو وہیں چلی جائیے"

بچوں کا جھوٹ ان ہی کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ بعض بچے کسی بازاری چمچ کی ناشائستہ یا مالدار کے  
ذمے اسکول کے نام سے بھاگتے ہیں۔ ایسے بچے اسکول کا حق ہوتے ہی ہیٹ کے در و کاپہانہ  
کر کے نقل آفسدہانے لگتے ہیں۔ متاجاگ اٹھتی ہے۔ چمچ کو کو سنے دیتے ہوئے وہ بچے کو ہکا  
ہے۔ ایسے ہزار اسکول تم پر سے قربان۔ جان ہے تو جہاں ہے۔

جوں جوں بچے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب دنیا کی کوئی طاقت سے اسکول نہیں بچ سکتی۔  
اس کے پیٹ کا درد بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ اور وہ گناہیں شک کر کھینے لگ جاتا ہے۔ چھوٹے

معلوم جھوٹ معافی اور رحم کے قابل ہے

جھوٹ بولنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن اس کو نبھانا انتہائی مشکل ہے۔ زیادہ جھوٹ وہی لوگ بولتے ہیں جنہیں سچ بولنا سکھایا نہیں جاتا۔ کچھ حلق جس ہمدردی ایک موٹی تازی رشتہ دار ملنے کیلئے گھرائیں قریبی بن اسٹاپ پر اترنے کے بجائے وہ بہت دور اتر کر باپتی کا پتی پیدل چلی آ رہی تھیں۔ ان کی پدیا تراکی طلاع مل چکی تھی۔ جب وہ ذرا دم بے چکس تو ہم نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے مختلف قسم کے اٹنے نیدھے سوالات کی بوچھلو کر دی۔ جب ان سے بہت دور سے پیدل چل کر آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: پیدل چلنے طبعیت چاہ رہی تھی اس لیے ایک اسٹاپ پہلے ٹرگنی۔ سچ کہتے ہوئے ان کا دم خشک ہوتا تھا اسی لیے وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ غلطی سے وہ ورت گئیں۔

ایک صاحبہ میں جو دیکھو توڑ جھوٹ بولتی ہیں۔ سنا کہ جب وہ گھر میں ہوتی ہیں تو قہامت اور ناقابل برداشت بھوکا چرچا کر کے دیواریں تھام تھام کر چلتی ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ باہر نکلتی ہیں تو یہ بھول جاتی ہیں کہ سڑک کے دونوں جانب کوئی دیوار نہیں۔ بغیر کسی سہارے تیز تر قدم ڈال کر جب وہ دوچار گھر مچانک آتی ہیں تو ان کا پول کھل جاتا ہے۔ جو خواتین مسلسل بیماری کا ڈھونگ رہا کرتی ہیں انہیں کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ سچا طرح کہ جب سنجیدگی سے بیمار پڑتی ہیں تو لوگ مسلسل جھوٹ سنتے سنتے اس سچائی کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ واقعی بیہوش ہو جائیں تو متعلقین یہ کہہ کر انجان ہو جاتے ہیں کہ بے ہوشی کا ڈرامہ تو ان کی زندگی کا ساتھی ہے۔ ایسی خواتین کو ہمارا مشورہ ہے کہ نہ رانے راجلی کی نیلمی کے ساتھ خود کو بھی بدل دیں کیونکہ اب نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ ناز اٹھانے والے۔ ضعیف ترین خواتین سفید ترین جھوٹ بولتی ہیں۔ عمر کی بھنگی کے ساتھ ان کے جھوٹ سننے کا انداز بھی اتنا جاندار ہو جاتا ہے کہ لوگ سچ مان کر بیوقوف بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسی

خواتین کو زندگی میں ایک بار عقلمندوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ ان کے جھوٹ کو بڑھا دینے کی کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے۔ مثلاً پیٹ میں شدید درد ہونے تو کھانا ڈٹ کر کیسے کھائیں۔ جان لیوا چکر بٹھنگا مارنی وی کیسے دیکھ رہی ہیں۔ انتہائی نفاہت ہے تو گھر گھر کی جھاڑو بنی کیسے پھرتی ہیں ہر گھر میں ایسے ہمت والے پیدا ہو جائیں تو سفید جھوٹ کا خاتمہ یقینی ہے۔

قہر منقر جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود جھوٹ کے پتلے جھوٹ سج لگانے جھوٹ کے دفتر اور جھوٹ کے پن باندھنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ جھوٹے بچوں کی شدید بیماری میں بھی والدین الٹی دوا اور غذا کا انتظام کر کے ملازمت کے لیے چلے جاتے ہیں۔ وہ دور بھی نہیں رہا کہ گھر میں ایک جھوڑ تین تین آدمی ہمیشہ خدمت کے لیے تیار رہتے ایک اوپری کام والی، ایک پکانے والی اور ایک مغلانی۔ آج کے زمانے میں ایک عورت اوپری کام والی بھی ہے، پکانے والی بھی ہے، مغلانی بھی اور ماں اور بیوی بھی لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ گھر کی مالک ہے۔

ایسے مشینی دور میں اگر ضعیف خواتین جھوٹ کا سہارا ایک دوسروں کو مستقل پریشان کرنا چاہیں تو یہ ان کی نادانی ہے۔ ملاوت کے نیس اور ایک چھوٹے کے حریر سے اگر نفاہت کم ہو جاتی تو طاقت کی دوایں جس کی قوت کا فوں میں دھری رہ جائیں۔ عطر کے اگر ایک پھلنے سے اگر بیہوشی چلی جاتی تو پھر ڈاکٹر دوا خانوں میں مکھیاں مارتے ہوتے۔ یہ حال زمانہ بدل گیا ہے بیہوشی کی جھوٹی، یکنگ کرنے والوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح صبح بیہوش ہو جائیں اور متعلقین ہمیشہ کی طرح جھوٹ سمجھ کر سینہ دیکھنے چلے جائیں۔

”بستے کی بات کہ دوں“ صبح صبح بیہوش ہونے کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

# حیدرآباد کی شادیاں

شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کے علاوہ قاضی اور دو گولہ کافی ہیں۔ حیدرآباد کی شادیاں کے بھی یہی لوازمات ہیں۔ دو دلعن کے اس میل کیلئے خاندان کے افراد دوست احباب پیشہ ور مشائخ کے علاوہ اخبار بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ آجکل حیدرآباد میں لفظ "شادی" کا مفہوم کچھ بدل سا گیا ہے۔ بیشتر شادیاں خالص کاروباری انداز میں انجام پا رہی ہیں۔ اشتہار بازی کے لئے اخباروں کے کالم مختص ہیں۔ اشتہار بازی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے "ایک معزز خاندان کی ۲۲ سالہ خوبصورت، نیک سیرت، مہموں و صلوات کی پابند لڑکی کے لئے ڈاکٹر یا انجینئر سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی کے دو بھائی، گرین کارڈ ہولڈر ہیں۔ بیروزگار لڑکے کو اندرون ایک ماہ باہر نوکری دلانے کا پورا ذمہ لیا جاتا ہے۔

اس قسم کے اشتہار دے کر لڑکی والے ایک طرح سے لڑکے کو مکمل طور پر خریدیتے ہیں۔ یعنی جوڑے گھوڑے کے نام پر کثیر رقم اور ملازمت دلانے کی ترغیب دے کر لڑکی کے دو بھائی و گریں کارڈ ہولڈر ہیں تو خدا سے دلعن کہ تیسرا بھائی بھی جلد از جلد کسی اور رنگ کا کارڈ حاصل کرے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اب آپ اس لڑکے کی غیرت کی دلوڑ بٹھیں جو لڑکی سے بے حساب روپیہ بیسہ ہر قسم کا سامان لے کر اسی کے بیسے سے اور اسی کا احسان اٹھا کر ملازمت کے لئے جاتا ہے۔ کاش ایسے سالوں میں سوچنے اور غور کرنے کا کچھ تو

حیدر آباد میں اکثر لڑکیاں دلے جوڑے کی رقم خود اپنی طرف سے مقرر کر کے لڑکے والوں کے دماغ خواب کر رہے ہیں۔ متوسط گھرانے کی ایک صاحبہ نے حماقت میں اگر اپنی لڑکی کی شادی پر ایک لاکھ روپے خرچ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس ایک لاکھ کے بجٹ میں انہوں نے اپنے چیزیں بیٹے ہوئے چالیس سال پرانے سموار، گنگال اور تانبے کے پرانے برتنوں اور زیور کو نئی قیمت لگا کر رکھا تھا۔ لڑکے کی ماں بہت ہی ہوشیار موقع پرست اور لالچی تھی۔ اس نے عین وقت پر قیمتی سامان کی فہرست مشاطہ کے ذریعہ لڑکے کے گھر بھیج دی کہ اس ایک لاکھ میں سے آپ جوڑے کے پچیس ہزار نکال کر بقیدہ رقم میں فریج، ٹی وی، گیسز واشنگ مشین، ٹیپ ڈیک، آلوین فریج اور الماس کانڈیور لے لیں۔ لڑکی واسے پریشان ہو گئے لیکن عزت کا معاملہ تھا۔ نہ رشتہ توڑا جاسکتا تھا اور نہ بغیر مانگ پوری کے رشتہ جوڑا جاسکتا تھا۔ رحم کی بھلیک انگ کر لڑکے کو کچھ کم رقم میں اگر خریدا جائے تو لڑکی طعنوں کا شکار ہو کہ زندہ رہنے پر مجبور ہوتی ہے یا دوسری صورت میں ایسے جینے سے موت کو گلے لگانا ہی بہتر سمجھتی ہے۔

شادیوں میں مہمانوں کی ضیافت مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ سردی کا موسم ہو تو چائے گرمی کا موسم ہو تو آئس کریم چائے سے بہت لگاؤ رکھنے والے میزبان شدید گرمی میں چائے ہی سے ضیافت کرنا پسند کرتے ہیں۔ گزشتہ چند دنوں قبل ہم نے سردی کے موسم والی ایک شادی میں شرکت کی۔ میزبان کو ہم ڈھونڈنا نہ پڑا تھا کہ ایک ویٹر نے بغیر طیشی والی چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام دی ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ گنجائش کے لحاظ سے کشتی میں صرف پیالیاں رکھی گئی ہیں۔ دوسرا ویٹر طیشی لے کر دے گا۔ اتنے میں ایک ضدی بچے نے دھکا مارا تو چائے پھلک کر گرنے لگی۔ ابھی ہم گیٹر میں پرگرتی ہوئی چائے کو سنبھالنے نہ پائے تھے کہ



دوسرے دینے لیک دینی سموسہ دوسرے نہ تھیں تھادیا۔ آجکل شادی کی دعوتوں میں دینی سموسے بنانے والے بادیچوں میں لیک مقابلہ ساہل رہا ہے کہ کون باریک سے باریک پرت والے سموسے تیار کر سکتا ہے اور کس کے بنائے ہوئے سموسوں سے مہمانوں کے کپڑے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔

شادی کے موقع میں لیک چھوٹا سا کاڈر لگا ہوتا ہے جس پر ”جو تھی ولیمہ ڈنر“ لکھا ہوتا ہے گزشتہ چند سال قبل یہ ڈنر الگ الگ ہوتے تھے۔ دوستی اور رشتے کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کاڈر رتے کے ساتھ بھیجے جاتے۔ کسی کو دو کاڈر کسی کو ایک اور کسی کو ایک بھی نہیں۔ بہر حال آجکل یہ دو ڈنر ایک ہو گئے ہیں۔ دیگ کے پاس عموماً دلیں کے باپ کا قریبی دوست بیٹھتا ہے جسے پکوان سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ ڈنر پر خرچ ہونے والی رقم دونوں سموسہ صلی طور پر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن بھی سموسہ بریانی، مرغ کا سالن اور ڈبل کا میٹھا منتقلین اپنے گھر لے کر چلے جاتے ہیں۔

گل فردوس اس لیے نہیں بچتا کہ یہ بچوں بڑوں سمی کام مغرب میٹھا ہے۔ اور لوٹ کر کنگال پن سے کھایا جاتا ہے باسی بریانی گھردلوں کے علاوہ دو چار دن رہنے والے رشتہ داروں اور پاس پڑوس میں رہنے والے لوگوں کے ناشتے میں کام آتی ہے۔ ایک ہی دن میں اس باسی بریانی کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں رنجش پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن جب اطلاع ملتی ہے کہ بغیر قلمی والے دیگوں کی کرامت سے سارے لوگ متاثر ہو گئے تو دولہا والے اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔

بعض شادیوں کے دعوت نامے بڑے دلچسپ مگر مصلحت آمیز ہوتے ہیں۔ موقع کے ساتھ ”جو تھی ولیمہ ڈنر“ کا کاڈر بھیج دیا جاتا ہے لیکن دو بچوں کے عقیقے کی دعوت برائی دی جاتی ہے عقیقے کے بکروس کہ بریائی بنتا ہے۔ کہنے کو تو شادی کی دعوت دی جاتی ہے لیکن بوشیار میزبان ایک ڈنر دے کر تین تین تحفے وصول کرتے ہیں۔

”جو تھی ولیمہ ڈنر“ کا کارڈ دود کے رشتہ داروں کو نہیں دیا جاتا۔ شکایت کرنا عادت ہے۔ یہ دعوت دینے والے کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن ستم ظریف بعد میں دُور میں نہ آنے کی وجہ پوچھ بیٹھتے ہیں۔ جب انہیں سنجیدگی سے بتایا جاتا ہے کہ ایسا کوئی کارڈ بھیجنا نہیں گیا تھا تو وہ اپنا بنیادی انداز سے اپنے بچاؤ کے لیے کہہ دیتے ہیں ”یقیناً ہم نے کارڈ بھیجا تھا گو گیم کا غور طلب بات ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے حصے کے کارڈ تو پہنچ گئے ہوں دیکھنے کو ملتے ہیں اور دور کے رشتہ داروں کے لیے پہنچ بھی ایسا استعمال ہوتا ہے کہ بچاؤ شادی کا رقعہ لانے والے کو کارڈ کے گرنے کی خبر تک نہیں ہوتی ہے۔ ایسی دعوت دینے والوں کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ بعد میں اس قسم کے سوالات کر کے تعلقات کو خراب ہونے نہ دیں مصروفیت اور بڑھتی ہوئی ہنگامی کئے اس دور میں شادی کی ایک دن کی دعوت میں شریک ہونا بھی بڑی بات ہے۔

حیدرآباد میں بڑے گھرانوں کی شادیاں بہت ہی شاندار پہلے پرانجام پادہی ہے ہزاروں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے شادی خانے بجائے جا رہے ہیں۔ اصل بڑھتے میاں کے ساتھ میزبانوں کی اخلاقی قدریں گرتی جا رہی ہیں۔ اکثر شادیاں میں دو لہاکا طوت سے دعوت دینے والی خواتین یعنی اس کی ماں اور بہن وغیرہ وقت مقررہ پر نہیں آتیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں جب شادی خانے میں قدم رکھتے ہیں تو اجنبی چہروں سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ دلہن کی طوت کے نوٹو گرافر بچے بغیر ویل کا کیمرا گلیس ڈالے صرف فلیش مالتے پھرتے ہیں۔ بے جالا ڈیس پلے ہوئے پیسے سجائے منڈپ کے پھول توڑنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ دلہن کی سہلیاں اپنے میک اپ کو درست کرتے میں مگن رہتی ہیں۔ قریبی سہلی کو اپنے بھلاؤ بتانے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ ایسے میزبانوں کے لیے ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ ہماں کو دیئے گئے وقت سے قبل شادی خانے میں موجود رہیں۔ وقت کی پابندی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خواتین دو بجے سے تیاری شروع کر دیں کسی کے رحم و کرم پر ہی ہوتی ایک کسست رفتار موٹر کے چکر کے

کے ملک کرایہ کی ایک گاڑی کا انتظام کریں۔ اور شادی خانے میں آنے کے بعد ضیافت کے موقع پر سب بہانوں کا احساس خیال رکھیں۔ ورنہ اکثر شادیوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک بہانہ دو قسم کی آکسیریم کا دو مرتبہ ذائقہ چکھتا ہے اور بازو بیٹھے دھلا منہ میں پانی لاتے ہوئے مینبران کو دل ہی دل میں گایاں دیتا ہے۔

آر سی مصحف: دھنگانے کی رسم جو نا چھپانے کی رسم کے علاوہ اور دوسری بہت سی دلچسپ اور مقبول رسومات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک دفعہ باہر سے آئے ہوئے ایک خاندان نے یہاں کی رسومات دیکھنے کی خاطر ہمارے ساتھ ایک شادی میں شرکت کی دولہا کا منڈپ سجا ہوا تھا۔ زنانے اور مردانے میں چہل پہل کچھ زیادہ بڑھتی نظر آئی۔ نکاح کا وقت آ پہنچا۔

دولہا شان سے سہرے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ کچھ لوگ آگے بڑھے انہوں نے اس کا سرا کھینچنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر بھول بکھر گئے۔ ہمارے ساتھ آئے اس رسم سے بہت غلطوٹ ہوئے انہوں نے کہا یہاں کی یہ رسم بڑی دلچسپ ہے اسے کوئی سمجھتے ہیں؟ ہم نے کہا یہ سہرے کی لڑیاں توڑنے کی رسم ہے۔ اور صرف ان شادیوں میں ہوتی ہے جہاں دولہا بیوی اور باشعور بچوں کی موجودگی میں عیاشی کی خاطر دوسری شادی رچتا ہے۔ آجکل حیدرآباد میں جو شادیاں ہوتی ہیں ان سے متعلق ایک خوش آئند بات جو محسوس کی جا رہی ہے وہ یہ کہ بعض گھرانے ایسے ابھر رہے ہیں جو جوڑے گھوڑے کے نام پر ایک پیسہ بھی لینا نہیں چاہتے وہ صرف سیرت اور خاندانی لوگ چاہتے ہیں۔ اس مبارک دن کا شدت سے انتظار ہے جب ایسے شریف گھرانے عام ہو جائیں گے۔ جوڑے کی رقم اور جہیز کی فہرست مانگنے کی فرسودہ لعنت ختم ہو جائے گی۔ یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ نوجوان قسلاً خصوصاً طلباء اس بات کا اہدہ کریں کہ نہ وہ جوڑے کے نام پر رقم لیں گے اور نہ جہیز کا مطالبہ کریں گے۔ شادیاں تو جب بھی ہوں گی فرق تنازعہ ہو گا کہ ان لڑکیوں کی بھی پوسکیں گی جو محض روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا گھر بھی رہنے پر مجبور ہے۔

# ریل۔ ریلوے اسٹیشن

گزشتہ زمانے میں ہوائی جہاز سے سفر کرنا قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ آج کل ویوے اسٹیشن اور ایئر پورٹ میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ جانے والے کو پھول پہنا کر جتتے پتے دیتے ہیں۔ فاریٹ فارم پر ڈالے جاتے ہیں اس سے زیادہ ایئر پورٹ پر بھی بکھرے جاتے ہیں۔ ہندیب و شائنگل اور صفائی کا مظاہرہ دونوں جگہ برابر ہوتا ہے۔ باہر جانے کے چکر کی وجہ سے ریلوے اسٹیشنوں پر ہجوم دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ایک مسافر کو چھوڑنے کے لیے بے شمار لوگ ریلوے اسٹیشن پر موجود رہتے ہیں۔ اکثر لوگ رستے راستے اندر جاتے ہیں۔ ٹکٹ چکر پر کام کا بار کم کرنے کے لیے، وہ واپسی میں چھوٹے محفوظ راستوں کو ترجیح دیتے ہیں درخت کرتے کرتے کے لیے آتے ہوئے چند لوگ ریل کے ڈبے میں جا کر سلمان اور سیٹ کی حفاظت کرتے ہیں۔ مسافر ریلوے اسٹیشن پر اپنے قریبی دوستوں یا منیگر سے باتیں کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گارڈ نے سیٹ دینی اور پھولوں کے ہار پہنا ہوا پلیٹ فارم پر ہی لہ گیا۔ آپ نے وہ لطیفہ سنا ہوگا کہ ریل چلنے لگی تو اندر بیٹھے ہوئے مسافروں نے بڑی مشکل سے ایک دوسری آدمی کو پکڑ کر ڈبے میں لایا۔

ریل کی رفتار تیز ہو گئی تو ان لوگوں نے بہادری سے کہا ذرا دیر ہوتی تو آپ پلیٹ فارم پر ہی لہ گئے ہوتے۔ اس آدمی نے شرمندہ ہو کر کہا ”در اصل مجھے جانا نہیں تھا میں اپنے

دوست کو چھوڑنے آیا تھا۔

اکثر ریل گاڑیاں لیٹ ہوتی ہیں۔ اس کے نقصانات کم ہیں بلکہ مختلف قسم کے لوگوں کے لئے مختلف قسم کے فائدے بہت ہیں۔ ایک فائدہ ان سرپرستوں کے لئے ہے جن کی باقاعدہ تیرہ سال والی لڑکیاں ذرا سے قدم پھینکنے سے گروپ کی شکل میں بمبئی بھاگنے کا ارادہ کر کے ٹرین میں بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ ٹرین لیٹ ہوتی ہے اس لئے منزل مقصود پہنچنے سے قبل ہی گھروں کو واپس لائی جاتی ہیں۔ دوسرا فائدہ آٹو والوں کے لئے ہے۔ ایک دفعہ محبوب نگر سے حیدرآباد آنے والی ریل نے اپنی منہایت سے ہم لوگوں کو رات کے ایک بجے سکندراباد ریلوے اسٹیشن پر لاکر چھوڑ دیا۔ آٹو والوں کے لئے رہبر بنانے کا یہ زرین موقع ہوتا ہے۔ ایک ہمدرد آٹو والے نے چلنے کی مادی بھر دی کہ وہ راستہ چلنے کے بعد وہ غلط راستے پر جانے لگا۔ لیکن جلد ہی اس کا دماغ درست کر دیا گیا تو وہ سنجیدگی سے کہنے لگا "میں شارٹ کٹ جا رہا تھا۔"

اکثر ریل گاڑیوں میں چوبیس گھنٹے کے سفر میں مسافر ایک دوسرے کے گھرے دوست بن جاتے ہیں۔

بعض ہمدردی میں ایسے لوگوں کے لئے بار بار ریل سے اکثر پانی بھی لاتے ہیں جو بیوی بچوں کو ریل میں چھوڑ کر نیچے اترنا نہیں چاہتے۔ یہ ہمدردی موت ہونے تک ادا نہیں جاتی ہے۔ شوہر زندہ ہے جو کہ کھانا رہتا ہے ایسی صورت میں ریل کا ہمدرد ساتھی کہتا ہے "آپ بے فکری سے سو جائیے مجھے جاگنے کی عادت ہے۔" بے فکری سے سو کر جب وہ اٹھا ہے تو ریل کا ساتھی اس کے سوٹ کیس سمیت غائب رہتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر متعین قلی بھی مسافروں سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ کراچی جانے کے سلسلہ میں جب ہم لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو بیک وقت کئی قلی سامان پر بٹھنے۔ ہمارے سامان کی قیمت کا فیصد جس قلی کے ہاتھ تھا اس نے ایک غمخوار کسٹم آفیسر کی میز تک

سلمان بجاظت پہنچا دیا۔ ذرا دم لیکر نرم لمبے میں پوچھا آپ کے پاس سلمان کیا کیا ہے۔ بھاری ساڑیاں کتنی ہیں۔؟ ہم نے قلی کو اطمینان دلایا کہ سلمان زیادہ نہیں ہے لیکن چہرے کی بے اطمینانی سے وہ بھانپ گیا کہ چھ سات سوٹ کیس یوں ہی نہیں لائے گئے ہیں۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا 'چار سو ہوں گے'۔ میرے سو، بابو جی کے تین سو' ہم نے رعب ڈالنے کے لئے کہا 'کیا مطلب' کا ہے کہ پیسے؟ یہ سنتے ہی قلی نے بابو جی کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ایک سوٹ کیس کھول کر سلمان کے سامنے رکھ دیا۔ یہ رنگ دیکھ کر ہم نے قلی سے کہہ دیا 'ٹھیک ہے دیکھو سو روپے دے دیں گے۔ قلی نے بابو جی کو سگنل دیا۔ سوٹ کیس بند ہو گیا۔ سلمان ریلوے پلیٹ فارم سے باہر پہنچ گیا۔ قلی نے فاتحانہ انداز سے دوپے بٹدے جیب میں رکھ کر چلتا ہوا کسٹم آفیسر اور قلی کے دوستانہ تعلقات اور دونوں کے ایک دوسرے پر اعتبار کے جذبے کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ ورنہ اس زمانے میں ایک بھائی دوسرے بھائی پر اعتبار نہیں کرتا۔

ریل کے سفر کے دوران مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ بڑتا ہے۔ اگر کوئی عورت مصیبت زدہ بن کر رو کر یہ کہے کہ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی نہیں توہر گز یقین نہ کیجیے۔ اسی عورت آگے چل کر مصیبتوں کے جال میں گھر سکتی ہے۔ بعض مسافر ریل اچانک پریشان کن بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور والی ریل میں ہمارے ڈبے میں ایک خستہ حال آدمی تھا۔ اس کے ساتھ تین بیٹیاں اور چھ بیٹیاں تھیں۔ ریل جب لاہور اسٹیشن کے قریب پہنچنے لگی تو اس آدمی پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس کی لڑکیاں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ڈبے میں موجود سارے مسافر پریشان ہو گئے۔ سمجھوں نے ہمدردی اور پریشانی کا اظہار کیا۔ بچیوں کو روٹی، بسکٹ، میوے، میٹھاں اور تیل کے ساتھ روپے دے گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر متعین کسٹم آفیسر اس کو اطلاع ہوئی۔ اس کے سامان تک جھڑپ نہیں لی گئی۔ سب کی ہمدردیاں سیٹے وہ پلیٹ فارم تک

باہر پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس خاندان کو ہم نے دیکھا۔ ان کے سوٹ کیس سلیقے سے جھے  
 جلے ایک طرف رکھے تھے۔ لڑکیاں ہنستی بولتی even up کی رہیں تھیں۔ دل کا  
 مریض سگریٹ کے کش پر کش لے رہا تھا اور مسلا کر نظروں ہی نظروں میں ہم مسافروں سے  
 بوجھ رہا تھا، کیوں؟ کیسے لڑ بنایا تم سب کو۔ اناری سے اتر کر جانے والی ایک ٹرین  
 میں ایک آدمی کیڑے کے دانت گرانے والا منجن پچ رہا تھا۔ اس نے ایک بیگ میں سے پٹیاں  
 نکالیں اور اپنے مخصوص کاروباری ہلمج میں منجن کے فائدے گنانے شروع کر دیے۔ اس ٹوہیے  
 میں موجود تین چار آدمیوں نے جلدی سے پیٹے نکالے اور منجن خرید لیا۔ قریب ہی ایک  
 شریف عورت بیٹھی تھی۔ اس عورت نے ایک چٹکی منجن دانتوں پر لگانے کی کوشش کی ایک سیکنڈ میں  
 منجن بیچنے والے کا ہاتھ عورت کے منہ تک پہنچا۔ ہلکے چھپکتے میں بغیر خون کا قطرہ ٹپکے  
 دانت اس منجن دانے کے ہاتھ میں تھا۔ سارے مسافر حیران رہ گئے۔ کئی لوگوں کی جیبوں  
 سے پیسے نکل کر منجن دانے کی جیب میں منتقل ہو گئے۔ ریل میں یہ دھندہ روز ہوتا ہے  
 اس عورت کا دانت روز گرتا ہے۔ ریل میں ہی ہے، پلٹ فارم وہی ہے، صرف اٹھنے  
 والے مسافر بدلتے رہتے ہیں۔

# میرا پہلا مزاجیہ مضمون پڑھنا

مضمون چاہے مجیدہ ہو یا مزاجیہ ایک باصلاحیت اور محنتی ادیب یا آسانی لکھ لیتا ہے۔ وہ اپنی اسی فطری صلاحیت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے مسلسل لکھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صاحب کفیف ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی ادیب کو جب پہلی مرتبہ ریڈیو یا اسٹیج پر آنا ہوتا ہے تو اس پر جو آفتوں کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اسی کا دل جاتا ہے۔

آج مجھے اپنے پہلے مزاجیہ مضمون پڑھنے کے تاثرات سننے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس سے قبل اپنی مزاج نگاری کی ابتدا کیے بارے میں بتا دوں تو ٹھیک رہے گا۔ بچپن کی بہت سی باتیں بہت سے دلچسپ واقعات میرے ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ ہیں۔ سوچتی ہوں کہ بہت سی باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں۔ ضرورت اور مزاج کے مل جلے حوائث میری فطرت میں اس وقت سے موجود تھے۔ ہائی اسکول اور کالج میں بھی ہمیشہ میری شرارت شائستگی کے حدود میں رہتی۔ میں نے ہمیشہ اپنے ایسا تذہ کی عزت کی۔ اور اس کا پھل اب مجھے اپنے شاگردوں سے مل رہا ہے۔ اسکول میں میں نے دو تین مزاجیہ نظمیں ننگو اور اردیس میں چلی لکھی تھیں۔ ہائی اسکول کے زمانہ طالب علمی میں دو تین موڈ میں کسی مزاجیہ موضوع پر لکھ دیتی اور ماہنامہ یا نو میں کبھی اشاعت کے لئے بھیج دیا کرتی۔ کئی سال کے وقفہ کے بعد میں نے ۱۹۶۰ء سے باقاعدہ لکھنا اور مضامین شائع کروانا شروع کیا۔ میں زندہ دلاں حیدر آباد



کے ادبی جلسوں میں کئی سال سے پابندی سے شریک ہوتی تھی۔ شروع سے آخر تک تمام مزاح نگاروں کو انتہائی دلچسپی سے سنتی تھی۔ اس وقت میرے مضامین شکوفہ میں شائع ہونے لگے تھے۔ مزاح نگاروں کو اسٹیج پر دیکھ کر ان سے مرعوب رہتی تھی۔ کسی سالانہ جلسہ میں ان کے رد و بد جا کر سلام کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ ۱۹۷۸ء کی بات ہے ایک دن مصطفیٰ اکمال صاحب ایڈیٹر ہفتنامہ "شکوفہ" کالج آئے اور اپنے مخصوص شائستہ اور سنجیدہ انداز میں مجھ سے کہا کہ اس سال آپ زندہ دلائل حیدر آباد کے ادبی اجلاس میں مضمون سنائیے ایسے لگا جیسے کہیں وہ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مضامین چھپتے ہیں تائبس ہی کافی ہے۔ لیکن انہوں نے اصرار میں اور شدت پیدا کر کے میری زبان سے کہوا لیا کہ اچھی بات ہے میں مضمون سنائوں گی۔

پہلے کا دن آج ہینیا وقت سے آدھا گھنٹہ قبل میں محلہ صی بھون پہنچ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگ آنے لگے کچھ دیر بعد کسی کرم زمانے ایک بیابان میرے ہاتھ میں تھارایا مجھے ایسا لگا گویا موت کے پردانہ مل گیا۔ مانپتے ہاتھوں سے میں نے بیابان تو لگایا لیکن اس کھلبلا اس احساس میں شہت ہو گئی کہ ہر کوئی مجھے دیکھ رہا ہے حالانکہ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر۔ تمام مضامین سنانے والوں کے ناموں کا اعلان ہوا اور سب کے ساتھ میں بھی اسٹیج پر پہنچ گئی۔ جلسہ شروع ہوا۔ جوں جوں کسی مزاح نگار کا مضمون ختم ہوتا اپنی باری کے خیال سے میرا دل بے نیکی پس سے دھڑکنے لگتا۔ موت واقعی سر پر منڈلا رہی تھی۔ اسٹیج کے قریب ہی بوگس حیدر آبادی کھڑے انتظامات میں مصروف تھے۔ انہوں نے پوچھا کیا! مرنے سے پہلے آپ کی آخری خواہش کیلئے؟ میں نے کہا مجھے موت ایک گلاس پانی چاہیے "بس اور کچھ نہیں" میں اس پانی اور گلاس کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ شکل ایک کھونٹ پانی میرے حلق سے اتر رہا تھا۔ باقی رہا گلاس وہ میرے ہاتھوں میں ناچنا چاہتا تھا۔ جھٹ سے میں نے اسے پیچے رکھ دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی

موقع محل ہے ناپچنے کو دینے کا۔ خود کیا تو پتہ چلکہ گلاس کا کوئی قصور نہ تھا۔ بیچارے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرے نام کا اعلان ہوا۔ کسی حال مجھے اپنی کرسی چھوڑنی پڑی۔ ٹیک پر آگ میں نے سانس روک کر تھوک ننگتے ہوئے کہا۔ ”میرے مضمون کا عنوان ہے ”بچہ باہر گیا ہے“۔ قسمت دیکھیے کہ عنوان سنتے ہی سامعین کی طرف سے تہقیریں بھی بارش ہونے لگی۔ ادھر میرا دم گھٹ رہا تھا کہ ابھی تو صرف ایک سیکنڈ گزرا ہے۔ باقی نو منٹ انچاس سیکنڈ کیسے گزریں گے۔ مضمون میں شروع ہوا۔

”اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور صدر خاندان کے ہاتھ میں چارٹرا سگریٹ کی بجائے ڈن ہل کا قیمتی پیکٹ دیکھیں تو کھٹ سے یقین کر لیجئے کہ اس گھر کا کم از کم ایک بچہ باہر ضرور گیا ہے۔“

ان ابتدائی جملوں سے بھی سامعین محظوظ ہوئے۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں اکسپریس بس کی طرح بغیر رکے تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی ہوں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں اپنے ہوش و حواس مکمل طور پر کھو بیٹھی تھی۔ میرے مرشد نے زبانی طالب علمی میں یہ بات بتائی تھی کہ اگر کوئی ایسا موقع آئے تو مقرر کو اپنے اوپر پورا اعتماد رکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ حاضرین جلسہ میں سب سے زیادہ عقلمند، باصلاحیت اور مشہور ہستی وہی ہے۔ دوسرے سب قابلیت میں اس سے کم ہیں۔ ایک سیکنڈ کے لئے دل نے مجھ سے کہا تو ہی سب سے قابل ہستی ہے۔ تیرا وجود دنیا سے ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ چال کاغذ نہیں بھولے۔

ملک بھر کے نامور طنز و مزاح نگار اسٹھ دکھانے لگے کہ حضور کر کے جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ہم پر رعب جملنے آئی ہے۔ ادھر صدر ادا بہان خصوصی کی پر اثر شخصیت بے مرغ کے قریب کھڑی تھیں۔ ہال پر فدا بھی نظر پڑی تو ایک سے ایک قابل لوگ کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ سب کچھ ایک طرف، میں اپنا مضمون پڑھتی رہی۔ بڑھتی رہی۔ مضمون کا

عند ان جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ ”بچہ باہر گیا ہے“ تھا۔ اس میں بہت سے واقعات ان ہی گھرانوں سے متعلق تھے جن کے گھر کا کوئی فرد ملک سے باہر ہے ایک موقع پر میں نے سنا۔

”غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ جب کوئی دیار غیر میں مرجاتا ہے تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے ہم بھی اس اصطلاح سے واقف ہیں لیکن غائبانہ ختمہ کے پھول یا غائبانہ کھیر چٹائی کا دعوت نامہ دیکھ کر حسم انگشت بر منڈاں رہ گئے۔ ریاض میں فاسے کی ختمہ ہوئی حیدرآباد میں اڑان نکالے گئے۔ نانا پھول پہنے حریرہ روٹی کھاتے ہوئے روپے سمیٹ رہے تھے۔ کویت میں پوترے کی پیدائش ہوئی تھی حیدرآباد میں حسم سے کھیر چٹائی گئی۔ دادا بیٹے کھیر چاٹ رہے تھے۔“

ان جملوں نے بھی مجھے توقع سے زیادہ قہقہے دیے۔ ادھر تھقہوں کی گونج تھی ادھر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تھوڑی دیر بعد میری نماز جنازہ میں یہی لوگ شریک ہوں گے۔ مضمین کے درمیان حد میں یہاں ہونے والے چھوٹے مٹے کا جوں پر اتھام اور فضول شہر کا ذکر غفلت سے عبارت پر ختم ہوا

”باہر کے کرشمے دیکھ کر ہمارے بھی من میں پانی آیا۔ چار تیرہ سالہ لڑکا جواب دیکھ ہمارے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے اس سے مخاطب ہو کر ہم نے کہا۔ ”بیٹا دیکھ باہر جائے گا لاکھوں کھائے گا۔“ ماں بابا کے لیے بلڈنگ۔..... ہماری بات کو کاٹتے ہوئے اس نے بگڑا ہوا ہے میں کہا باہر جانے کا نام لئے ماں تو آج سے اکھول جانا بند۔ لایسے نوالہ۔ نوالہ پورا کر کے خدا حافظ کہتا ہوا بچہ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دودانہ پر کھٹکا ہوا۔ کچھ رشتہ دار سعودی عرب سے ملنے آئے تھے۔ ادھر ادھر دیکھ کر تھوڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا آپ کا بچہ کہاں ہے ہم نے

سرد پکار کے فخریہ انداز میں کہا۔ بچہ ملہر گیا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلے۔

آخری چیلے پر بہت سے لوگوں نے بے اختیار داد دی۔ جلسے کے اختتام پر اکثر سامعین کی طرف سے مبارکباد بھی ملی۔ اس وقت تک بھی میرا دلی کچھ زور ہی سے دھڑک رہا تھا۔ شاید مجھے ستانے والے لطف آ رہا تھا۔

اس سخت امتحان سے جلن توں کر کے گزر گئی۔ اہل اجلاس کا ٹیپ شدہ پروگرام حیدرآباد کے مزاح نگار سید نفرت نے سعودی عرب سے منگولیا تھا۔ ان کا ایک خط منگوفہ میں شائع ہوا جس میں انہوں نے جلسے کے تمام مزاحیہ مضامین کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”ڈاکٹر حبیب ضیا ہماری عقل میں پہلی بار آئی ہیں لیکن خوب آئی ہیں۔“

اس مضمون کے بعد مجھے زندہ دلان حیدرآباد نے ہمت افزائی کی ہے، متواتر تین سال مضمون ستانے کا موقع دیا۔ اور مجلس عالمہ کا رکن بھی بنادیا۔ ۱۹۸۱ء میں میرے طنزیہ لہجہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ”گویم مشکل“ کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں وہ مضمون بھی شامل ہے جس نے میری حرکت قلب کو بند کر دیئے کا منصوبہ بنھ دیا تھا یعنی وہی پہلا مضمون ”بچہ باہر گیا ہے“ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ مختلف اصحاب نے گویم مشکل کے جن مضامین کو پسند کیا ان میں یہ مضمون مشترک ہے

بہر حال ایک بڑے جلسے میں زندگی میں پہلی بار جو مضمون سنایا، سچا وہ میری زندگی کا ایک یادگار تجربہ تھا۔ ایک کڑی آزمائش تھی جو زندہ دلان حیدرآباد کی طرف سے لی گئی تھی۔ اس واقعہ کے بارے میں سوچتی ہوں تو کبھی شرمندگی ہوتی ہے۔ لہذا کبھی اپنی بزدلی اور ڈرپوک پن پر ہنسی بھی اُٹھاتی ہے کچھ بھی ہو پہلی بار جو میں نے ایک بڑے جلسے میں مزاحیہ مضمون سنایا وہ میری زندگی کا ایک اہم اور کبھی نہ بھلایا جانے والا واقعہ ہے۔ اس نے جہاں مجھے بہت ہمت دیا وہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا۔ اسکو میں خدا کا دین سمجھتی ہوں مستقل مزاجی سے لکھتی چلی جا رہی ہوں

# حیدرآباد کی سڑکیں

کبھی کسی نووارد کو آپ نے یہ پوچھتے سنا ہوگا "یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟ حیدرآباد کی ہر سڑک کے بارے میں اس سوال کا ایک ہی جواب ہے "یہ سڑک دواخانے جاتی ہے" گذشتہ چند برسوں میں ماہرین تعمیرات اور متعلقہ ذمہ دار افراد کی مہربانی سے حیدرآباد کی سڑکیں خستہ تر ہو گئی ہیں۔ سڑکوں کی تباہ حالی کی وجہ سے ٹائرس ٹیوب والوں، ٹی بی کے ڈاکٹروں اور جراحوں کی پانچوں انگلیاں گھٹی ہیں۔ ہم جسے سڑک کہتے ہیں وہ کچرا، کچھڑ، کھڑے کھلے مین بول اور چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر کا نام ہے۔ اکثر سڑکوں پر عرصہ سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے آگے جانے والی گاڑیاں، بے وقت، بے موقع گھٹتی ہیں جس کے نتیجے میں ہر روز ہر سڑک پر کافی دیر تک راستے بند ہو جاتے ہیں۔ جن عورتوں کو ناف برابر کر دلانے کی بات ہے وہ سڑکوں سے بہت خوش ہیں۔ جراح اور لیڈی ڈاکٹرس دست بدعا ہیں کہ یہ سڑکیں یوں ہی خستہ رہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خدمت کا موقع دے سکیں۔ اکثر خواتین نو چیمنے کے بجائے سات چیمنے میں بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ میڈیکل ہال واسے پریشانی ہیں کہ دند نہ بڑھانے والی دوا بالکل فروخت نہیں ہو رہی ہے۔ حالانکہ حسب معمول آبادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے چنگی خانہ آنے والی ایک خاتون سے اس بارے میں استفسار کیا اس نے جواب دیا میں نہ

کوئی سودا استعمال نہیں کی صرف آٹو میں بیٹھ کر گھر سے یہاں آئی ہوں۔“

برصغریٰ مولیٰ آبادی پر ترس کھا کر سڑکوں کی گشاہی کا کام تیزی سے شروع کیا گیا۔ کسی کا محن کم ہوا، کسی کا دراندہ آدھا ہو گیا تو کسی کا گھر، گھر و ابن گیا۔ آنا مانا تنگ سڑکیں کشادہ بن گئیں۔ لیکن ناجائز بچوں کی طرح ان سڑکوں کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ اکثر سڑکیں ضرورت سے زیادہ چوڑی ہو گئی ہیں اس کے باوجود ہر کوئی ان سے اپنی گاڑی بچا کر پرانی سڑک پر چلنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

سارے شہر میں سڑک سے لگے ہوئے پچھلے دستے ہیں۔ اردو زبان پر جان چھڑکنے والے ان راستوں کے لیے انگریزی لفظ فٹ پاتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان پر سے پیدل راہروں کے چلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اتفاقاً کہیں فٹ پاتھ اچھی حالت میں ہیں تو وہاں ایسے سیوا پر مستقل رہتے ہیں جنھیں اور کہیں جگہ نہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے۔ روزگار کا مسئلہ ہے۔ اکثر جگہوں پر فٹ پاتھ خالی دیکھ کر لوگ چلنا چاہتے ہیں تو آگے ایک مٹی کا ڈھیر، لائٹ کا کھمبا یا پتھر پڑے ہوں گے۔ یہ نہیں تو ایک عدد گر مٹھا ضرور ہو گا۔

دکاندار روز اپنی دکان کے سامنے جھاڑو دیتے ہیں۔ بڑی خوشی ہوتی ہے کہ صرف دکان بلکہ فٹ پاتھ پر بھی جھاڑو ہوتی ہے۔ لیکن جھاڑو کو سڑک پر پھرتے دیکھ کر خوشیوں پر پال پھرجاتا ہے۔ دکاندار کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ وہ کمرے کو اپنے جائز مقام پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

سڑک کے کنارے کمرے کی کنڈی نام کی چیزیں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ ہمیشہ غلاظت سے بھری رہتی ہیں۔ اکثر کنڈیاؤں خوش قیمت ہیں اس لیے کہ بعض لوگ کچرا کنڈی میں ڈالنے کے بجائے باند ڈالتے ہیں۔ شہر کی سڑکوں میں جب سے لانا دگر گڑھے پڑ گئے ہیں کمرے کو کنڈی تک پہنچانے کے بجائے ان کو مٹھوں میں اندھاں دیا جا رہا ہے۔

یہ سڑکیں اتنی ہالی بے مروت ہیں۔ ان پر آئے دن لوٹ مار، قتل و غارت گری ہوتی ہے۔

دن دھاڑے منگل سوتر اڑانے جلتے ہیں، راہ چلتی عورتوں اور لڑکیوں پر آواز سے کسے جلتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں کہتیں؛ کچھ نہیں کرتیں۔ کریں گی بھی کیا۔ یہ خود قابل رحم ہیں، مصیبت زدہ نہیں، تنہا یہ کہ بے بسی میں یہ سڑکیں جنہوں ڈرینج کے آنسو دھتی ہیں۔ ان کے یہ آنسو بہتے بہتے ناسور بن گئے ہیں۔ کوئی ان کا غمگسار نہیں کوئی چارہ ساز نہیں۔

ایک سیل بھی انسان جیسے ہو گئے ہیں۔ انسانوں کی طرح سڑک پر کھڑے آنے جانے والوں کے ٹیئے دکاؤں سے رہتے ہیں۔ سیل بھٹے یا موز کے پھٹکے کھلنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو انسان کی کنکال نگاہیں ایسے عریاں پوسٹرس پر ہوتی ہیں جن کی کشش اسے سینا ہال کے اندر پہنچاتی ہے بے وقوف نہیں جانتا کہ وہ سین فلم میں نہیں ہوتا۔ پوسٹرس دیکھ کر سینا ہال کا رخ کھٹے والوں پر سیل طنز یہ مسکراتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں یہ سین پکچر میں ہوتا تو ہم سیل بنے یہاں کیوں کھڑے ہوتے۔

وہ سڑک انتہائی خوش نصیب ہے جس پر سے کسی مہاراجہ یا مہارانی کی موٹر نلک جھپکتے میں گزر جاتی ہے۔ ایک لمحہ سہی لیکن اس سڑک کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ راتوں رات کھڈوں میں مٹی پتھر پھر کر سڑک کو شاندار بنا دیا جاتا ہے۔ یہ شاندار سڑک جاتا رہیں ہوتی پھر بھی سڑک ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پہلی مرتبہ حیدر آباد کے لوگوں کا شعور بیدار ہو ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کے لیے بھوک مڑناں کو رہے ہیں، محضر بھیجے جا رہے ہیں۔ کمرے کے خوبصورت پارسل بنا کر متعلقہ افراد کے پاس بھیجنے کی دھکی بھی دی گئی ہے اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ سڑک ضرور بنے گی لیکن راہ گزروں کی تسلی کے لئے بنے گی۔ اوپر سے تھوپی گئی مٹی اور فالتو ڈانبر اپنی اصلیت بہت جلد ظاہر کر دیں گے۔ ڈانبر کی ہلکی پرت تلے دبے ہوئے پتھر پکار اٹھیں گے، ہمیں ان لاریوں سے بچاؤ۔ آج کل لاریاں انسانی جسموں کو وحشیانہ طریقہ سے گھسیٹتی چلی جا رہی ہیں۔ پتھر تو پتھر ہی سڑک پر خاموش سے بڑے رہتے ہیں ہی ان کی بھلائی ہے۔

# الطوالے

زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ تیز رفتار زندگی کے اس دور میں انسان میں وقت کی قدر کرنے کا کچھ تو سلیقہ آگیا ہے۔ وقت کی اس قدر کمی، وہ عموماً بے بسی سے ہر آنے جانے والی باتوں کو دیکھنے کے بجائے آٹومیں سفر کرنے کو ترجیح دینے لگا ہے۔ سڑکوں پر جو آٹو چلتے دکھائی دیتے ہیں ان میں زیادہ تر انجن کی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے سن مانی تکلیف دہ آوازیں نکالتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ ان کی ناقابل برداشت آوازوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ نہ آوازوں پر پابندی ہے نہ میٹر پر۔ آٹو اور اس کے میٹر کی چال میں فرق یہ ہے کہ آٹو چلتا ہے، میٹر بھاگتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خراب میٹر ولے آٹو سے سابقہ پڑنے پر میٹر میں بڑھتے ہوئے روپیوں پر نظیرس جم جاتی ہیں اور خون کے دباؤ میں کمی یا زیادتی کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ خوش قسمتی سے ہمیں نئے انجن والے آٹومیں سفر کرنے کا موقع ملا۔ ہمدانی مسٹر قبل کا ٹھکانہ نہ تھا۔ یقین نہیں آتا کہ ہم آٹومیں بیٹھے ہیں۔ نہ آٹو آواز کر رہا تھا نہ آٹو والا ہم سیلوں سے رہا نہ گیا۔ ہم نے آٹو کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔

”آٹو کتنا اچھا ہے۔“

”ہاں آرام دہ بھی ہے۔“

”ذرا سی بھی آواز نہیں ہو رہی ہے۔“



بھٹکے بھی نہیں دے رہا ہے۔ جس پہلی بار اس نے اچھے آٹو میں بیٹھنے کا موقع ملا۔

یہ گفتگو آٹو والا سن رہا تھا۔ اس کا میمان خاموشی بھرنا ہو کر پھٹکنے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ آٹو کے ہینڈل سے مکمل طور پر ہٹالیا جب سے سرخ رستی نکالی اور آٹو کے سامنے لگے شیشے کو صاف کرنے لگا۔ اب ہماری خیر نہ تھی۔ وہ خوشی میں مست تھا۔ آٹو کا شیشہ صاف کرنے کے بعد وہ اپنی ذات پر توجہ دینے لگا۔ یقین مانئے ہم نے صرف آٹو کی تعریف کی تھی۔ آٹو والے کی نہیں۔ لیکن اس نے بازو لگے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ دیکھ ہاتھ سے بال برابر کئے اطمینان نہ ہوا تو کنگنا نکالا اور بال جانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کے چہرے ہاتھ آٹو کے ہینڈل سے الگ ہو جاتے۔ یعنی آٹو میں بیٹھنے والوں کو وہ مکمل طور پر خدا کی حفاظت میں دے دیتا۔ آٹو صاف کرنے اور بال سنوارنے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوا۔ آپ نے جو تعریف کی اس کا شکریہ۔ میرا آٹو اس سے بھی تیز چلتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے جل جلالتیڑھٹے رہنے کی ہدایت کی۔

اکثر آٹو والے انتہائی لاچار وہی اور تیز رفتاری سے آٹو چلاتے ہیں۔ ایسے آٹو میں بیٹھتے ہیں زندگی اور موت کا فلسفہ یاد آجاتا ہے۔ یعنی زندگی ناپائیدار ہے اور آٹو میں موت یقینی ہے۔ اس کے باوجود آٹو میں مرنے کے بجائے گھر میں مرنے کو ترجیح دیتے ہوئے ہم آٹو والے سے رفت و آمد کم کرنے کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی تیز رفتار آٹو کا ذکر ہے جس سے ہمیں سابقہ پڑا تھا۔ اس کے بریک بھی غالباً کنٹرول میں نہیں تھے۔ برق رفتاری سے چلتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کو دے دی۔ زوردار بریک جو پڑا تو ہمارے دونوں گھٹے سامنے لگے لوہے کے ڈنڈے سے جا لگے۔ شدید تکلیف پر قابو پا کر ہم نے آٹو والے سے کہا ”میرے دونوں گھٹے پھوٹ گئے ہیں، آٹو کی رفتار زور دھمی کو۔ اس نے آٹو کی رفتار اور تیز کر دی۔ جھنجھلا کر کہنے لگا ”آپ کے گھٹے پھوٹے ہیں مجھے تو سر پر مار لگی ہے، میرا سر چلا رہا ہے۔ مجھے اس ٹیکسی والے کو

پکڑنا ہے جسے میں تے ٹکر دی تھی۔ اس کے بعد آٹو والے نے آٹو کی رفتار اور تیز کر دی اور اس وقت تک ٹیکسی کا پیچھا کیا۔ جب تک کہ دونوں کے راستے نہ بدل گئے۔

ہماری کچھ عادت سی ہو گئی ہے آٹو میں بیٹھتے ہی آئینہ الکرسی پڑھا شروع کر دیتے ہیں اس دن بھی پڑھ رہا تھا۔ ٹیکسی سے ٹکرا کر جب آٹو رک گیا تھا اس وقت رفتار بگم کرنے کی درخواست پر آٹو والے نے غصے سے کہا تھا۔ "اگر آٹو کے پیچھے لکھا ہوا شعر پڑھئے۔ آٹو پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

موت کو میں گے نگا لنگی ۔ زندگی تیرا اعتبار نہیں۔

اس شعر کے پڑھنے کے بعد راسخوری طور پر ولایودہ حفظاً وحوالہ علی العظیم کے جیسے بلاکازیند ہم نے یہ مصرعہ دہرانا شروع کر دیا۔

موت کو میں گے نگا لنگی ، موت کو میں گے نگا لنگی

بازو بیٹھے ہوئے ہمارے بچے نے پوچھا "حال ! آپ کیا پڑھ رہی ہیں ؟ ہم نے کہا "آئینہ الکرسی" بچے کو یقین ہو گیا کہ خلل دماغ کی یہ پہلی خطرناک علامت ہے۔ ہمارے منع کرنے پر بھی بعد میں رازدارانہ طور پر دماغ کے ڈاکٹر سے بہاری دماغی حالت کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ آٹو کے شعر پر یاد آیا۔ ایک آٹو پر لکھا تھا ہے

آج عمل ہے حساب نہیں ۔ کل حساب ہے عمل نہیں

تشریح :- آٹو والا پولیس والے سے کہہ رہا ہے کہ مسافر کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے اسے دھوکہ دینے اور سامان لے کر پلٹے بننے کا آج ہی کا دن ہے آج کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آج عمل کا دن ہے البتہ کل حساب ہوگا۔ یعنی آپ مجھے تلاش کرنے نکلیں گے۔ اسی لیے جو کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیے ! ایک آٹو پر لکھا تھا ہے

موت کیا شے ہے تم کو کیا سمجھائیں ہم ۔ راستے میں مسافر کو نمینہ آگئی

تشریح :- آٹو والا مسافر سے کہتا ہے کہ نفل محبت کی نشریح میں کن الفاظ میں کروں راستے کا استعمال یہاں فہم معنی ہے۔ جس طرح نیلے آنسو تک کے سفر میں کسی بھی وقت آدمی کا آنکھیں موند لینا یقینی ہے۔ اس طرح میرے آٹو میں بیٹھنے کے بعد کسی موڑ پر کسی چوراہے پر مسافر کو نیندا آسکتی ہے۔ نیند سے مراد یہاں ابھی نیند ہے۔

اس قسم کے ہمت دلانے والے اشعار آٹو پر خوش خط لکھے ہوئے ہیں۔ آٹو والے آٹو کی نفی خرابی کو کبھی دہر نہ کریں گے۔ نہ آٹو صاف رکھیں گے نہ اپنی زبان۔ اپنے یونیفارم کی صفائی اور اپنے اخلاق پر کبھی توجہ نہیں دیں گے۔ لیکن جہاں تک موزوں اشعار کا تعلق ہے ان کے انتخاب میں پوری توجہ دیتے ہیں۔

آٹو والوں سے جن لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے ان ہی کے دل جلتے ہیں کہ یہ مسافرین سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ ایک دفعہ ہماری اسکوٹر کی انگریسی بیٹھ چکی تھی ہمیں باہر جانے کے لئے بہت زیادہ پریشانی اُس لئے نہیں ہوئی کہ اس ہفتہ آٹو والے اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہفتہ خوش اخلاقی منارہے تھے۔ ایک آٹو میں بیٹھ کر ہم نے خوشی خوشی کہا۔ "رائی گج" آٹو والا مسکرایا۔ انتہائی خوش اخلاقی سے بولا "فوراً اتر جائیے میڈم" مجھے اس طرف جانا نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی دن ایک آٹو والے نے قسم کھائی تھی کہ وہ بات نہیں کرے گا اور منہ پر پٹی باندھ کر آٹو چلائے گا۔ ہم اس آٹو میں بیٹھ گئے۔ منزل مقصود پہنچ کر ہم نے میٹر کے مطابق کرلیہ اس کی طرف بٹھایا آٹو والے نے سامنے چاقو کے ساتھ لگی پرچی کی طرف اشارہ کیا جس پر لکھا تھا "میٹر بے تین روپے زائد دے کر خاموشی سے چلتے بنو ورنہ بعد میں خیر نہیں"۔

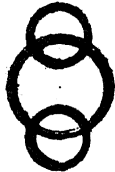
ہر آٹو والے کی اپنی ایک مخصوص پالیسی ہوتی ہے۔ مسافر سے بات کرنے کا علاوہ ڈھنگ ہوتا ہے۔ بعض مسافرین کو خاموشی سے آٹو میں بٹھالیتے ہیں۔ راستہ بھر کسی قسم کی حجت نہیں کرتے بس کن جب کرلیہ لینے کا وقت آتا ہے تو ان کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے پاس کچھ مہمان آٹو میں آئے۔ آٹو والا ان سے زوردار آواز میں تکرار کر رہا تھا۔ "چار روپے زیادہ رکھ دیو تم

طریقہ ہوتا کیا؟ تین سہاری بول کے چھ بیٹھ گئے۔ ہم نے تعجب سے کہا ”چھ کیسا ہیں تین ہی تو ہیں!“ وہ غصے سے کہنے لگا۔ ”توال اڈھے ہوئے تین بچے اور ان کے باسکٹ مارک چھ نہیں ہوئے؟ کوئی آٹو والا ہوتا تو بتا دیتا۔ ہم نے پوچھا پھر تم کون ہو؟ اس نے ٹری کاٹ کے شرٹ کے کنارے کو سیٹھا کرتے ہوئے کہا ”میں آٹو والا نظر آ رہا ہوں؟ آٹو کا مالک ہوں“ ہم نے سوچا یہ بہت بیک بیک کر رہا ہے اسے پولیس اسٹیشن کی دھکی دینی چاہیے۔ ”پولیس اسٹیشن چلو وہیں بات کریں گے۔“ وہ اطمینان سے بولتا کون ڈرتا ہے پولیس والوں سے، ان کو معمول چپ نہیں دیتے ہم۔

ہم نے زیر لب کہا ”معمول لینے والوں کا علاج کرنے والا غیر معمولی ڈاکٹر اب آگیا ہے۔“ نالو سے فیصد آٹو والے بڑے ہمدرد ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کے آٹو سے وقت کام آنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ کسی لڑکی کے اغوا کا معاملہ ہو یا کسی کو دور لے جا کر قتل کرنے کا منصوبہ، ان کا بھرپور تعاون رہتا ہے؟ اکثر حاضر دماغ مسافر آٹو کے پچھلے حصے میں بھاری کپڑوں کا سوٹ کیس، زیورات کا بریف کیس اور اسی قسم کا قیمتی سامان رکھ کر اتر جاتے ہیں۔ بعد میں اخبار میں ”سامان کی گمشدگی“ کے زیر عنوان آٹو والے کو اطلاع دیتے ہیں۔ ایک عدد سوٹ کیس جس میں بھاری کپڑے تھے اور زیورات کا بریف کیس میں آٹو میں رکھ کر اترتے وقت لینا بھول گیا۔ آٹو والے صاحب سے درخواست ہے کہ نیچے دے ہوئے پتے پر سامان پہنچا دیں۔ سواری خرچ کے علاوہ بچا کس روپے انعام بھی دیا جائے گا۔

کون سا بے وقوف آٹو والا ہو گا جو اپنا قیمتی وقت برباد کر کے ہزاروں روپے کا سامان واپس دے کر بچا کس روپے خیرات لے جائے گا۔ آٹو کے پچھلے حصے میں وہ سامان اسی لئے سیلو سے جاکر رکھتا ہے کہ مسافر اسے وہیں جا بوار رکھ کر غفلت میں اتر جائے۔

ایک فیصد آٹو والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہزاروں کامان آٹو میں رکھا دیکھ کر چین سے  
 سو نہیں سکتے۔ ساری رات بے چینی سے نہل کر وہ صاحب کامان تک کامان سمیت  
 پہنچ جاتے ہیں اور انعام میں دیا ہوا پچاس یا سو روپے کا نوٹ بھی واپس کر دیتے ہیں۔  
 اگر کبھی آٹو والے ایسے ہو جائیں تو سمجھئے کہ قریب امت قریب ہے۔



# حلہ

سینگاری کی قلت آج کا اہم ترین موضوع ہے۔ جو ملک سیاست سے نادانف ہوتے ہوئے بھی سیاسی موضوعات پر ادب، پٹانگ باتیں کہنے کے بظاہر دوسروں پر رعب جلاتے اور حقیقت میں خودیہ وقف بننے والے بھی اب ریزگاری کو اپنا موضوع سخن بنائے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں تو چلہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جوتے، چپل، کپڑے اور دوسرے مکان والے اپنا حساب کتاب روپیوں ہی میں رکھتے ہیں۔ کہیں ساتھ ستر پیسے بڑھ جائیں تو وہ فریادیں سے گاہک کو معاف کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی نوٹ ذرا بھی داغ دار ہو تو فقیر، دکاندار، چھوٹے بچے، آٹو والے، پوسٹ آفس والے سبھی لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن کراچی میں یہ مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ کم سے کم خیرات ایک روپیہ ہے۔ یعنی وہاں کے لوگ ایک کانٹہ خیرات کرتے ہیں۔ پان کھا کر ۵ روپے کے نوٹ سے ہاتھ پرکھتے چونا صاف کرتے ہیں اور دس کے نوٹ سے منہ پونچتے ہیں۔ ان رنگ بزرگی پہلے برائے نوٹوں کو لینے سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

جبکہ میں نے لکھا ہے پاکستان میں کم سے کم خیرات ایک روپیہ ہے۔ ایک دفعہ ہم وہاں کے ایک شاپنگ سٹر کے پاس موٹر میں بیٹھ کر بنجالی سی پی رہے تھے ایک خوش پوشاک فقیر لڑکا ہاتھ ہمارا ہم نے شان سے پرکس میں سے ایک انھنی نکالی اور اس کی

طوف بڑھاتے ہوئے دعاؤں کا انتظار کرنے لگے۔ اٹھنی دیکھتے ہی اچھی خاصی فقری آن کی آن میں  
سیرنی بن گئی۔ ہماری مٹھی اٹھنی سمیت بند کر کے اوپر ایک روپیہ رکھ کے یہ کہتی ہوئی آگے  
بڑھ گئی ”چل چالیں چھوڑو اور خیرات کرنا سیکھو“۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی فقری کو ہم  
نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ چل نہیں ہے تو جواب ملا ”موٹر سے اترو اور میرے ساتھ چلو“۔  
موجودہ دور میں ساتھ ستر پیسے کی تو بات ہی چھوڑیے، سو روپے کا نوٹ ایسے  
ختم ہو رہا ہے جیسے کچھ برس پہلے دس روپے کا ہوتا تھا۔

ایک بار عجب صدر خاندان کے پاس دو بچوں نے ملازمہ کو بھیجا کہ پیسے مانگ کر لائے  
ملازمہ گئی، با ادب کھڑی ہوئی اور کہا سرکار! بڑے بابا، منجے بابا چار پیسے منگوا رہے  
ہیں۔ یہ سن کر انہیں غصہ آگیا جھلکار کہا حرام زادوں کو کچھ کام نہیں ہے چار چار پیسے لے کر  
آؤ گی کریں گے۔ ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ”کچھ تو بھی کھاتے بول رہے ہیں“۔  
”کچھ تو بھی کھاتے کھاؤ کہ سن کر وہ آگ بگولہ مہر گئے کہنے لگے ”گو کھاؤ بول۔ میں چار پیسے چھوڑ کر  
ایک دھیلا بھی نہیں دیتا۔ یہ کج سے ۵۷ سال پرانا واقعہ ہے جب بچے چار پیسے  
میں نوکرے والی سے سب کچھ خرید کر پکا بھی بیٹے تھے۔ برطعنی گرانی کے اس دور میں  
وہ دن بھی دور نہیں جب بچہ باپ کی پیٹھ پر جھولتے ہوئے کہے جھا۔ بابا، بابا! سو روپے  
دیجیئے ناں، باپ شفقت سے پوچھے گا کیا کر دو گے بیٹے سو روپے لے کر۔ وہ لاڑے  
جواب دے گا ”کچھ تو بھی کھاؤ گا۔“

ہمارے پاس ایک فقری آتی تھی۔ گھر پر آتے ہی وہ بغیر دم لینے بے تکی دھائیں  
دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ کچھ اس انداز سے شروع ہوتی ”محبت بھری مراد اللہ کے  
نام پر خیرات کرو“ اللہ تمہاری شرافت، سخاوت، حماقت میں ترقی دے۔ اس قسم کی  
خطرناک دعاؤں سے بچنے کے لیے ہم جلدی سے کھانا سالن، پانی اور پیسے سب ایک

ساتھ لے جا کر اس کے سامنے رکھ دیتے تاکہ وہ زبان کو لگام دے اور کھانے میں مصروف  
 ہو جائے لیکن وہ بڑی ڈھیٹ تھی۔ کھانا کھا کر ڈکار لینے کے بعد وہ بڑے آرام سے بیٹھ  
 جاتی، پھر کپڑوں کی فرمائش کرتی، اپنے لیے، اپنے چیتے بڑھے فقیر کیلئے پترا پوتری کے لیے۔  
 وہ نہ وقت دیکھتی نہ موقع، اس لئے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ہم نے اس سے ہاتھ  
 جوڑ کر کہا تھا ہر مہینے کی صرف پہلی جمعرات کو آجایا کرے، ہم منہ مانگی خیرات دے دیا کریں گے  
 لیکن اب کچھ دنوں سے ہم اس سے درخواست کر رہے ہیں کہ ہمارے گھر کے دروازے  
 ہمیشہ اس کے لیے کھلے ہیں۔ جب فرصت ملے آجایا کرے، اس فقیرنی کے آتے ہی ہم اسے  
 پیٹ بھر کھانا کھلا دیتے ہیں۔ پھر اس کا ہاتھ دھلا کر برتن اٹھاتے ہیں۔ نذرانے کے طور پر  
 کپڑے پیش کرتے ہیں پھر اسے ایک روپیہ دے دیتے ہیں۔

جوں ہی وہ روپیہ لے کر پیسوں کی قبلی نکالتی ہے ہماری ترسی ہوئی نگاہیں اس کے  
 جمع کئے ہوئے چلر پر پڑتی ہیں۔ عید پر نئی ساڑی دینے کا وعدہ کر کے بیوی بچے کو چلر  
 مانگ لیتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار وہ آتی نہیں۔ اب ہمارا یہ حال ہے کہ چلر لینے سے پہلے  
 ہی کس کا فورٹ کاغذ میں لپیٹ کر رشوت دینے کے انداز سے اس کے سامنے دکھ دیتے  
 ہیں وہ چلر گنتی ہے ہم فرط مسرت سے اپنے دو فل ہاتھ اس کے سامنے ہمارا دیتے  
 ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ایک دفعہ ہمارے اوپر والے فلیٹ میں رہنے والی لڑکی اپنی ماں سے کہہ  
 رہی تھی، 'اسی امی جلدی آئیں۔ ایک فقیرنی آئی کو اتنی بہت سی خیرات دے رہی ہے۔'  
 حمید آباد کی ایک روایت یہی ہے کہ سنا گھر میں کسی پسندیدہ منظر یا ڈانس کے  
 پیش کے جانے پر چلر اچھالا جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ سے یہ روایت دم توڑ چکی ہے۔  
 رلم تیری گنگا میلی جیسی فلم کے عرباں سے عربیاں سین دیکھ کر لوگ چلر اچھالنا تو کجا  
 سیٹی بجانا بھی بھول گئے ہیں۔ چلر اس لیے نہیں اچھالتے کہ وہ خود چلر ہو گئے ہیں۔



رہا میں بچنے کا سوال تو ایسے مناظر دیکھ کر بعض شریف ناظرین کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ اس نیم عریاں عورت کو دیکھ کر انہیں اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کا خیال آ جاتا ہے۔ میں اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں جب ان کا ضمیر ان پر ملامت کرے گا۔ اور وہ اس کے لیے شدید قسم کا احتجاج کریں گے۔ اکثر سنتے ہیں کہ فلاں فلم سے فلاں فلاں سین نکال دے جانے والے ہیں۔ کچھ دن نمائش کر کے اعلان کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وقت کو غنیمت جانو، جلدی سے آنکھیں سینک لو۔

آج کل ریزنگاری کچھ اس طرح دا پس ملتی ہے۔ کرانہ مرچنٹ کو سو روپے کا نوٹ دیں تو تیس روپے اور ایک کیڈبری، میڈیکل آل ولے کو جلد واپس کرنا ہو تو دو روپے دے کر یہ گاتے ہوئے دو وکس کی گولیاں ہاتھ میں تھا دیتا ہے۔ وکس کی گولی کو کچھ کچھ دودھ کر دو۔

ہوٹلوں میں سگریٹ کی ڈبی کے ٹوٹے پر کچھ لکھ کر دیتے ہیں۔ کنڈکٹرس اس معاملے میں بہت فائدے میں ہیں۔ ابتداء میں چلر نہ دینے پر مسافر کو خوب ملامت کرتے ہیں۔ پھر روپیے کے ٹکٹ کے پیچھے لکھ کر دے دیتے ہیں۔ اور جب مسافر کے اترنے کا وقت آتا ہے تو بس کی بھید میں دور کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا بیگ چلر سے بھرا ہوتا ہے ریزنگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ جو لوگ محض لٹکوں کو گھومنے اور انہیں دھکے مارنے کے لئے بس میں سفر کرتے تھے وہ اب کنڈکٹر کی قربت کو پسند کرنے لگے ہیں اور ان کی کنگال نگاہیں روٹیوں کے ٹکٹ کنڈکٹر کے بیگ پر رہنے لگی ہیں۔

چلر واپس کرنے کا سب سے نالا انداز آٹو واٹس کا ہے۔ یوں تو وہ سال میں ایک مرتبہ ہفتہ خوش اخلاقی منکر باقی دنوں میں اپنے بد اخلاق ہونے کا مکمل ثبوت دیتے ہیں لیکن

مسافر گھماترتے وقت وہ انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حبیب میں ہاتھ ڈال کر بہت ہی شریفانہ اور مخلصانہ انداز میں کہتے ہیں "چلر نہیں ہے صاحب" اس طرح بغیر جھگڑا کے ہر مسافر سے روپیہ درپردہ و پیہ زائد لے ہی لیتے ہیں۔

ہر حال ہر ذی شعور چلر جمع کرنے کی دھن میں ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ اپنے پاس سے چلر نکالے اور خیر کرے۔ جوں ہی میں نے یہ مضمون مکمل کیا، اخبار کی سرگما برنظر پڑی، وزیر فینانس نے یہ خوش خبری دی ہے کہ مارچ ۱۹۸۶ء تک ریزگاری کی قلت دور ہو جائے گی۔ خوش خبریوں اور اعلا فاضل کے سوا یہ لوگ اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہونے والا ہے یہ وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تو ہم سب کو اپنا موجودہ رویہ ہی برقرار رکھنا چاہیے۔ ۵۵

# جہیز کی لعنت اور سماج

جہیز دینے کا رواج عرصہ دراز سے چلا آ رہا ہے۔ لوگ اپنی استطاعت کے مطابق لڑکی کے لئے جہیز جوڑنا شروع کر دیتے تھے لیکن لڑکے والوں کی طرف سے یہ پوچھا نہیں جاتا تھا کہ جہیز میں کیا کیا چیزیں دی جا رہی ہیں لیکن اب حالات نے ایسا پٹا کھایا ہے کہ لڑکی کو دیکھتے اور رشتہ طے ہونے سے قبل ہی جہیز کی فہرست مانگنے کا چلن علم ہو گیا ہے۔ لوگ ایسے علاقے ہو گئے ہیں کہ اسے محبوب بھی نہیں سمجھتے۔ مشاطہ کے ذریعہ جہیز کی فہرست منگوائی جاتی ہے۔ اس فہرست میں فریج، ٹی وی، صوف سیٹ، الماری، سنگھار مینر کھانے کی مینر، ڈز سیٹ، گنگال سلور اور دیگر اشیاء کے علاوہ کپڑے اور سونے کی مقدار لکھنی پڑتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اکثر گھروں میں یہ عمل دہرایا جا رہا ہے کہ سسرال والے چاہتے ہیں فریج اور دیگر اشیاء کا اثاثہ وہ خود کریں۔ مخصوص کمپنیوں یا دکانوں کی نشاندہی کر کے لڑکے کو بتاتے ہیں کہ وہ ساتھ چلیں گے۔ وہی چیز لی جائے گی جسے وہ پسند کریں گے۔ بعض گھروں کی مثالیں میرے سامنے موجود ہیں۔ لڑکی والوں نے لڑکے کے ظاہری ٹھٹھا اور اس کی جانی داد سے مرعوب ہو کر اپنی لڑکی دے دی۔ ابتدا میں تو ان لوگوں نے جوڑے جہیز، زیور وغیرہ سے لاپرواہی اور بے نیازی ظاہر کی لیکن جوں جوں شادی کی آگ لگی انہوں نے فرمائشوں کا اتنا ڈھیر لگا دیا کہ لڑکی والوں کو مجبوراً اپنی جائیداد

فروخت کر دین پڑی۔

بھیک مانگنے والے کا ہاتھ ہمیشہ پھیلا ہی رہتا ہے اس کی بھولی کبھی نہیں بھرتی۔  
یہی حال جہیز مانگنے والوں کا بھی ہے۔ شاعری میں محبوب کی زلف یا جدائی کی رات کا  
جو تصور ہے اس کا اطلاق جہیز کی فرست پر بھی کیا جاسکتا ہے۔  
جہیز کی فرست مانگنے والوں کو فرست کچھ اس طرح دی جاسکتی ہے۔

۱۔ دیر طھ گز کو بی چادر

۲۔ سلور کی پرانی رکابی۔ چادر لوڑھنے کے لئے اور رکابی ہاتھیں لے کر گھر گھر بھیک  
مانگنے کیلئے، ۲ جوڑ پرانی چلیں، چلو بھر پانی ڈوب مرنے کے لئے۔

شادی اب اکثر گھرانوں میں لڑکے اور لڑکی کے ازدواجی بندھن میں بندھے جانے کا  
نام نہیں رہی۔ بنیادی اہمیت لین دین اور دیگر لوازمات کو دی جانے لگی ہے۔ ایک  
گھرانے میں شادی کے شرائط یعنی جوڑے کی رقم، جہیز کی فرست وغیرہ طے ہونے کے بعد جب  
ساچن کی رسم کا دن آیا تو لڑکی والوں نے جائے کا اہتمام کیا اور سمدھادے سے آنے والوں کی  
تعداد پوچھی۔ اس پر وہاں سے جواب ملا جب سے رشتہ طے ہوا ہے آپ لوگوں نے ایک  
دن بھی کھانا نہیں کھلایا کم از کم ساچن کے دن کھانا کھلایا جائے لڑکی کے باپ کو غصہ آگیا انہوں  
نے کہلویا "کھانا تقسیم کروں گا اپنے اپنے برتن ساتھ لائی۔"

مختلف اخباروں اور رسائل کے تراشے میرے سامنے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے  
کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایسے ظالم اہل لالچی لوگ مجبور ہیں جو روپے پیسے کے آگے کسی  
کی بھی پروا نہیں کرتے۔ عذاب الہی سے بے خبر ایسے کلام کئے جا رہے ہیں۔ دلہنوں کو جہاز اور  
غلاف ادیتس پہنچانے اور انہیں جلا کر مار ڈالنے کے واقعات عام ہو چکے ہیں۔

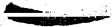
حال ہی میں ٹی وی پر ایسی خواتین کا انٹرویو کیا تھا جنہیں سسرال والوں نے جلا کر

ختم کر دینے کی کوشش کی تھی جو ابھوری رہ گئی۔ ان خواتین کے چہرے جھلے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے والدین نے اپنی استطاعت اور وعدہ کے مطابق سب کچھ دیا۔ اس کے باوجود سسرال والے ان سے کبھی مطمئن اور خوش نہ رہے۔ ہر سال کتنی عورتیں ایسی ہیں جنہیں زندہ جلایا جا رہا ہے یا جہیز نہ لانے یا جہیز کم لانے کا طعنہ دے کر انہیں مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں۔

۵۴ ویں کل ہند دیمنس کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر ملکتی وزیر بہبودی خواتین نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ مرکزی حکومت نے خواتین کی رضا کارانہ تنظیموں کو جہیز کی وجہ سے جو اموات واقع ہو رہی ہیں اس کی تحقیقات کیلئے تحقیقاتی ایجنسیوں کا موقف دینے کا قانون انسداد جہیز میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسداد جہیز کے لیے قوانین بنائے جا رہے ہیں حکومت اس کے لئے اقدام کر رہی ہے۔ لیکن صرف حکومت کو اس کا ذمہ دار قرار دینا ٹھیک نہیں۔ سراج سے جہیز کی لعنت بالکلہ طور پر ختم ہو سکتی اس کے لئے نوجوان نسل کو راست قدم اٹھانا ہوگا۔ لڑکیوں کے لئے بھی یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں اظہار خیال کریں۔ جہیز مانگنے والے گھرانوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جانا چاہیے۔ چند دنوں سے ایک بات میرے ذہن میں بس گئی وہ یہ کہ میں اکثر سوچتی ہوں آج کل کے لڑکے خواہ وہ کالج کے ہوں یا یونیورسٹی کے ذرا سی بات منوانے کے لئے مارنے مرنے تیار ہو جاتے ہیں۔ توڑ پھوڑ مچاتے ہیں۔ نعرے بازیاں کرتے ہیں۔ دیواندہل پر پوسٹر لگاتے ہیں یہی لڑکے اپنے والدین کی ذہنیت کو بھی بدل سکتے ہیں۔ یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے متعلقہ اور طبقہ کالجوں کے طلباء سے میں خصوصیت سے مخاطب ہوں۔ جہیز کی بڑھتی ہوئی لعنت کو سرے سے شانے میں ان کا بھر پور تعاون رہے تو پھر لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ کسالی سے حل ہو سکتا ہے۔ جو توڑ پھوڑ اور مار پیٹ وہ کالج میں کرتے ہیں جہیز کے

خلاف اسی عمل کو اگر اپنے اپنے گھروں میں دہرائیں تو چیز کی مانگ کرنے والی مائیں منٹوں میں درست ہو سکتی ہیں اگر طلباء میری درخواست پر سنجیدگی سے غور کریں اور متحد ہو کر چیز کے خلاف آواز اٹھائیں تو سماج سے یہ لعنت بالکل طور پر دور ہو سکتی ہے۔ کچھ تجاویز پیش کر رہی ہوں۔ چیز مانگنے والی لاپنجی خواتین یقیناً ان تجاویز کو سن کر چراغ پا ہوں گی لیکن بس میں اپنی غلطی پر خد ہی نادام ہوں گی۔ لڑکیاں اور خصوصاً کالج کی طالبات پہل کریں۔ اور بلا خوف و خطر بلکہ بلا جھجک اعلان کریں کہ چیز کی مانگ کرنے والے گھرانے کی بہو بن کر وہ ہرگز نہ جائیں گی اس طرح چیز مانگنے والوں کو دو چار سال تک ہر گھر سے نفی میں جواب ملے گا اور ان کی چھٹی اولاد کی کنپٹیاں چکنے لگیں گی تو ان خواتین کے دماغ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اسی طرح بڑے ایک انجن بنائیں۔ اپنی ماؤں کو پابند کریں کہ وہ جوڑے کی رقم اور چیز کا مطالبہ نہ کریں گی۔ جلسے تو قہرغم کے ہوتے ہیں کچھ جلسے اس نیک اور بامقصد کام کے لیے بھی مختص کر دیں سال میں کم از کم دو مرتبہ بڑے بیمانے پر ایسے جلسے منعقد کریں ان میں مختلف طبقات کی نمائندگی کرنے والے دانشوروں کو مدعو کریں۔ ان سے خواہش کریں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات لوگوں تک پہنچائیں۔ چیز کی لعنت کو ختم کرنے کی تجویزیں سامنے رکھیں۔ اس کے بعد طلباء بھری محفل میں اپنے ناموں کا اعلان کریں اس عہد کے ساتھ کہ وہ جوڑے کی رقم اور چیز کا مطالبہ نہ کریں گے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے ہفتہ وار خصوصی ایڈیشن میں ”اپنے نام“ قابلیت پتہ اور دوسری ضروری تفصیلات شائع کرواتے جائیں اس سے لڑکی والوں کو موزوں لڑکوں کے انتخاب میں سہولت ہوگی اور ہزاروں لڑکیاں جو محض منہ مانگا چیز ساتھ نہ لے جاسکتی تھیں، سسرال کرنا اور ان کا گھر بسا سکیں گی۔ وقت کا تقاضہ کہ لاپنجی عورتوں کو نہ بلکہ آج ان میں اتنا شعور اور احساس پیدا کیا جائے کہ وہ جو کام کر رہی ہیں وہ سچ کیلئے ایک بنیاد ہے۔ چیز مانگ کر لینا اور اس کی نمائش کرنا یا ایک ایک سے کہتے پھرنا کہ ہوتا سارا چیز لائی ہے سوچئے تو کتنی بے شرمی کی بات ہے۔ میں پھر ایک بار یاد دہانی کرتی ہوں کہ یہ کلمہ کسی ایک کے بس کا نہیں چیز کی لغت کو سچ سے ختم کر دینا اسے







مزاح نگاری کیلئے چیتے کے جگر اور شاہیں کے قبضے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاح دراصل دودھاری تلوار ہے جو مسرت بھی، خشتا ہے اور بعیرت بھی عطا کرتا ہے۔ کہیں نظم لکھ گئے، مانگے ہنسی ہنسی میں ٹوٹتے ہیں۔ مزاح نگار سماج کی نابھاریوں، بنی نوع انسان کی کمزوریوں کو جس لطیف انداز میں بیان کرتا ہے وہ ناصح، مشفق یا رہنمائے قوم کے بس کا روگ نہیں

ڈاکٹر حبیب ضیاء تلوار کی اس کاٹ سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے بڑے لطیف پیرائے میں سماج اور فرد دونوں کی فروگزاشتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے کئی مضامین لطافت اور صداقت کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔

روزمرہ کے مشاہدات اور زندگی کے حقائق کو مزاح کے روپ میں ڈھالنا اسچھے مزاحیہ ادب کی شناخت ہے۔ بہت کم عورتیں ادب کی اس مخصوص صنف میں اپنے جوہر دکھا رہی ہیں۔

سرزمین حیدرآباد نے جہاں اجلی دنیا کو اعلیٰ پایہ خواست ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر، محقق، نقاد، بحثیے وہیں امید بندھتی ہے کہ مزاح نگاری میں حیدرآبادی خواتین اپنا مقام پیدا کریں گی۔ اس صنف ادب کو ڈاکٹر حبیب ضیاء سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ اُنہ کرے مرحلہ شوق نہ ہوئے کے مصداق ڈاکٹر حبیب ضیاء اسی طرح کے ستھرے مزاحیہ ادب کی تخلیق کرتی رہیں گی

پروفیسر رفیعہ سلطانہ

سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، جامعہ عثمانیہ

ملک میں خاتون مزاح نگاروں کی کمی ہے۔ جسکی وجہ سے مرد مزاح نگار سکون و اطمینان کے ساتھ بلا خوف و خطر طنز و مزاح کے میدان پر قہجہ جلتے بیٹھے ہیں۔ ویسے چند خواتین جو دیگر اصناف ادب میں اپنے فن کے جہر دکھا رہی تھیں، طنز و مزاح کے میدان میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے کے لئے اتریں۔ چار مقلباتیاں کھانے کے بعد پورے خشوع و خضوع اور حضور قلب کے ساتھ توبہ کر کے اپنے اصلی میدان میں واپس چلی گئیں۔ البتہ شفیقہ فرحت اپنی پوری ہمت زناتہ کے ساتھ ڈٹی ہوئی ہیں۔

اب جو ڈاکٹر حبیب ضیاء طنز و مزاح کے میدان کا زار میں پورے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اتری ہیں تو زندہ دلاں حیدر آباد کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے کہ خبردار اب وہ وقت آگیا ہے کہ اقسیم طنز و مزاح پر خواتین کا قبضہ ہونے والا ہے۔ اور تم لوگ مجاہدین کی طرح چھاپہ مار جنگیں لڑتے رہ جاؤ گے۔ (ویسے سیاسی جنگ تو عرصہ ہوا کہ مرد ہار چکے ہیں) موصوفہ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ”گویم مشکل“ اردو اکیڈمی آئندہ رپورڈیش اور پچ ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ کی اعانت سے شائع ہوا ہے جو ادب کی اس صنف میں قابل قدر اضافہ ہے۔

طنز و مزاح کے بارے میں میرے ذاتی خیالات وہی ہیں جو مغربی مصنفین کے ہیں کہ اس جاسکتا ہے کہ یہ غلامانہ ذہنیت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کے مشہور و معروف مزاح نگاروں نے بھی مغربی انداز فکر سے استفادہ کیا ہے۔ غرض میرا یہ ایقان ہے کہ چاہے افسانوی ادب ہو یا طنز و مزاح اس کی بنیاد چار خصوصیات پر رکھی جاتی ہے۔

پہلی خصوصیت ”زبان“ ہے جو حکاک کا ہتھیار ہے۔ اس کے بغیر فن کار تنہا میدان میں

اتر ہی نہیں سکتا اس خصوص میں ڈاکٹر حبیب ضیاء اردو کی سندرکھتی ہیں جس طرح میڈیکل کالج سے کسی ڈاکٹر کو ایم بی بی ایس کی سند عطا کر کے یہ اجازت دے دی جاتی ہے کہ جاؤ لقمان اب تم جتنے چاہو قتل کر سکتے ہو۔ تم پر کوئی عدالت مقدمہ نہیں چلا سکتی اسی طرح ڈاکٹر حبیب ضیاء کو بھی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کر کے یہ اجازت دے دی ہے کہ۔ جاؤ خاتون اب تم جتنے چاہو زبان کی غلطیاں کر سکتی ہو۔ کوئی برقی آشیانوی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن ان کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے کہ اس جائز حق سے پوری کتاب میں انہوں نے کہیں نا جائیز فائدہ نہیں اٹھایا۔

دوسری خصوصیت 'زندگی' یعنی "ہلڈا" ہے جو ڈاکٹر ضیاء کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے زندہ (بلند بعض زندہ درگور) کرداروں میں رچی بسی نظر آتی ہے۔ کوئی 'مضمون' ایسا نہیں ہے جو زندگی کے حقائق کو بجا مطالعہ سے عاری ہو۔ جن مضامین میں یہ بات شدت سے نظر آتی ہے وہ ہیں "بچہ باہر گیا ہے" "جلنے" "پانی" اب تک ایسا نہیں تھا" وغیرہ

مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو۔ "بچپن، جوانی، ادھیڑ پن اور بڑھاپا انسانی زندگی کے یہ چار ایسٹج ہیں۔ ان میں آخری ایسٹج بڑا خطرناک بلکہ جہنناک ہے۔ سبھی ضعیف خطرناک نہیں ہوتے۔ اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر بے ساختہ ان کی درازی عمر کے لیے دل سے دعا نکل جاتی ہے۔" (مضمون اب تک ایسا نہیں تھا)

تیسری خصوصیت کردار کی "Psychological Study" یعنی نفسیاتی مطالعہ ہے معلوم نہیں انہوں نے میری طرح 'نفسیات' بہ حیثیت اختیار سی یا لازمی مضمون کے پر مطالعہ کیا نہیں لیکن ان کے تمام کرداروں میں نفسیاتی مطالعہ نہایت عمیق نظر آتا ہے۔ مثلاً ہمارے بھی ہیں امتحان میں طلباء کی نفسیات، بدیسی مان میں ماں کی نفسیات اور ساس نے کیر و سین ڈاکٹر میں ساس کی نفسیات وغیرہ۔ نفسیاتی مطالعہ کیلئے یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

”ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑیوں ہوئی۔ کام والی کی عمر کیا تھی۔ بہ صدمت شکل کیسی تھی؟ رنگ کالا تھا یا گورا؟ شادی شدہ تھی یا کنواری؟ اپنے اسے رکھا کیوں تھا؟ ان سوالات کے جوابات مشکل تھے۔ شرافت کی ہر کی وجہ سے پہنے اس طرف دھیان نہیں دیا بدریں غور کیا تو لٹھا ٹھٹھا“ (مضمون گویم مشکل)

جو تھی خصوصیت *subconscious mind* سپریشن کا تیز اور گہرا مشاہدہ۔ اس نوع میں بھی ڈاکٹر ضیاء کا باب ہیں۔ اس کی مثال مضمون ”لاٹ“ میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہیں ”اگر کنوارا ہے تو..... ایک نووی کے علم میں نرم ہاتھوں کو اور نرم کرتے ہوئے سرگوشی کے لذائذ میں کہتا ہے۔ یلی انھوں۔ ہیرا انجھا۔ کونسی چڑیاں چائیں۔؟

مصنفہ کی تحریروں کی اہم خصوصیت یہ ہے اس کا لہجہ ہے۔ وہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جملے نہیں بناتیں بلکہ جملے ان کے ذہن سے سکون کی طرح ڈھل کر نکلتے ہیں۔ لیکن ایک کہ بھی کھوتا نہیں ہوتا ایک اور نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مخالف صنف کو طنز و مزاح کا نشانہ نہیں بناتیں۔ جیسا کہ بلا لحاظ صنف عام مزاح نگاروں کا شیوہ ہے

ڈاکٹر ضیاء کے تحت الشعور *subconscious mind* میں طالب علمی کے زمانے ہی سے جس مزاح *sense of Humour* پرورش پائی ہوئی ہے۔ عمل اور تعلیم کی منزلوں کو طے کرنے کے دوران یہ جس بھی پروان چڑھتی رہی۔ اور جب انہوں نے کھل کر لکھا شروع تو ان کے فن میں پختگی اچھی تھی۔ اب صرف مشق ان کو درجہ کمال تک پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھا کریں۔ ”سیار نویسی کے الزام کی پرواہ نہ کریں کیونکہ جس مبالغہ میں زیادہ پانی رہتا ہے وہی کھینچوں کو سیراب کر سکتا ہے۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے ان کے دیباچہ کا یہ جلد..... تب گھر سے جانا ہو تو سرخ رنگ کی چادر اوڑھے خاموشی سے چلی جاؤں“ ان کی مشرقی تہذیب کے وابستگی اور

بیکترہ خیالات کا آئینہ دار ہے۔ کتاب میں کتابت کی غلطی کو جی ترس گیا۔ البتہ طباعت نے خوش کر دیا۔ ملک کی غریب و خستہ حالی کے پیش نظر (۱۷۶) صفحات کی کتاب کی قیمت صرف بارہ روپے رکھی گئی ہے

## برق آشیانوی

ڈاکٹر حبیب ضیاء کا پہلا مضمون جو میں نے زندہ دلان حیدر آباد کے ادبی اجلاس میں سنا تھا وہ تھا "بچہ باہر گیا ہے"۔ ان کے پہلے ہی جملے نے سب کو چونکا دیا اور پھر جہاں جہاں انہوں نے چاہا حاضرین سے تمقہ وصول کئے۔ وہ اپنا مضمون خود ہی سنائیں تو دلنشینی دو دھاری تلوار کی کاٹ بن جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے میں بھی ان کے مضامین کا اثر کچھ کم لطف انگیز نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء خالص مزاح کی بھی قائل نہیں ہیں۔ وہ مزاح کی آرٹ میں طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ یہ چھوٹے ہتھیار اس چابکدستی سے سما جی ناسردوں اور انسانی کمزوریوں کو نشانہ بناتے ہیں کہ زخم بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

## رشید قشری

ڈاکٹر حبیب ضیاء بظاہر خاموش سی اور غیر ضروری طور پر سنجیدہ نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کی کم گوئی اور کم سخن خیالات کی کم مائیگی نہیں بلکہ بہ نظر احتیاط ہے۔ اور یہ احتیاط ان کے مضامین میں بھی ملتی ہے۔ اس لیے نہ تو ان کے مزاح میں پھلجھڑیوں کی سی کیفیت ہے نہ طنز میں وہ کاٹ کہ آدمی تلملا اٹھے۔ بس ایک تبسم زیر لب، اک ہلکی سی ککٹ اور ہی اسچھہ طنز و مزاح کی خصوصیت بھی ہے۔ سلیقہ، اظہار شائستگی اسلوب اور لہجہ کی شگفتگی یہ میں

دوسری خصوصیات، ڈاکٹر حبیب ضیاء خوب سے خوب تر کی طرف رواں رواں ہیں۔

## پروفیسر بدیع حسینی

ڈاکٹر حبیب ضیاء چور دروازے سے مزاح کے میدان میں آئیں حبیب توفیق کا برقعہ اوڑھے، جیسے انہیں خوف ہو کہ کسی محقق کا مزاح لکھنا اس کے مرتبے کے منافی ہے۔ لیکن جب پردہ ترک کیا اور زندہ دلائل حیدر آباد کی سالانہ تقریب میں برسر عام مضمون پڑھا تو داد و تحسین کی بارش نے ان کے دل سے اس خیال کو دھویا اور آج وہ طنز و مزاح کے میدان میں اپنے نام کی طرح مردانہ وار آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ رواں شستہ، تیکھی زبان لگدگاتے مزاح کے ساتھ طنز کی زیریں لہر، موضوعات میں تنوع، ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریر کے خاص وصف ہیں۔

## ڈاکٹر مصطفیٰ اکمال

آزاد و ادب میں یوں تو طنز و مزاح کی صنف میں لکھنے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس میں اب بھی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے فطری میلان طبع کے باعث ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اس ذمہ دارانہ اور مشکل صنف ادب کو اپنایا ہے۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کا طنز و مزاح نہایت لطیف اور سبک ہے۔ جسے پڑھ کر ہنسنے پر ہلکا سا تبسم عیاں ہو جاتا ہے۔ اردو میں کنگ انگریزی الٹی ہے۔ یہی ماں کے بچے کی شگفتگی، اسلوب و اظہار کی شائستگی اور اچھے طنز و مزاح کی دلیل ہے

جاوید عزیز (پاکستان)

جلیب ضیاء نے بھی مزاج نگاری کی طرف توجہ دی ہے۔ دکنی زبان کی قواعد اور  
 ہمارا چکرش پرشاد حیات اور ادبی کارنامے جسی گتایی بھی انہیں کی ہیں۔ پتہ نہیں یہ  
 احساس کہاں تک درست ہے، لیکن نگاہی ہے کہ جلیب ضیاء کا مزاج تحقیق کا  
 زیادہ مزاج کا کم ہے۔ ان کے ہاں طنز و مزاح پر سنجیدگی کی چادر تہی رہی کہ یہ لطف اندوز  
 ہونا کم ہی محتاج ہے۔ اور پھر آمد کی کمی۔ کج کے معاشی اور معاشرتی طور پر اوسط  
 طبقے کی زندگی، ان کی کامیابیاں، ان کی محرمیاں اور زندگی گزرنے کے لئے ان کی  
 مساعی وغیرہ جلیب ضیاء کے موضوعات ہیں۔ ان کی نگاہ تیز ہے جب ان کی قوت  
 احساس میں بھی یہی تیزی اور شدت پیدا ہو گئی تو ان کے مضامین غرہ دیں گے جلیب ضیاء  
 نے طنز کو کام میں لایا ہے اس ضمن میں ان کا دلچسپ مضمون ہے ”بچہ باہر گیا ہے“  
 جہیں ان دنوں باہر خصوصاً مشرق وسطیٰ جانے والوں اور یہاں ان کے عزیزوں  
 اور احباب پر اتنے حقیقت پسندانہ طنز ہیں کہ جلیب ضیاء تھوڑی بہت داد وصول  
 کر رہی لیتی ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جباریہ

کج کے اموی اور سائبی دور میں اردو نثر و ادب میں طنز و مزاح کا عنصر نہ ہونے  
 کے برابر ہے۔ عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، بطرس بخاری جیسے طرانت نگار  
 اب چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی مشکل نظر آئیں گے اس لئے آپ کی دلچسپ تصنیف  
 ”گوئم مشکل“ بڑی حد تک اس خلا کو پر کرنے میں معاون ہے۔ امید بندھتی  
 ہے کہ آپ ایسی ہی تخلیقات کے ذریعہ اردو زبان کے ایک اہم لیکن فی الحال تاریک  
 گوشہ کو منور کرتی رہیں گی

مصطفیٰ اشروانی